UrduDost Library
UrduDost.com

# نامہ بر

## (افسانے)

ڈاکٹر سید سعید نقوی

رنگِ ادب پبلی کیشنز

جملہ حقوق محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | نامہ بر(افسانے) |
| مصنف | : | ڈاکٹرسیدسعیدنقوی |
| کمپوزنگ | : | شیرازی شاعر |
| اشاعت | : | جولائی2010ء |
| بااہتمام | : | بزمِ رنگِ اَدب، کراچی |
| قیمت | : | 300/= روپے |
| بیرونِ ملک | : | 10ڈالر یا5پاؤنڈ |
| پبلشرز | : | رنگِ اَدب پبلی کیشنز، کراچی |

(0345-2610434)
Email:Rangeadab@Yahoo.com



مصنف سے رابطہ:
ڈاکٹرسیدسعیدنقوی
51-Arbor Field Way
Lake grove NY-11755
+1-469 955 9428
saeedsyed64@hotmail.com



تقسیم کار

ویلکم بک پورٹ۔ مین اُردو بازار۔ کراچی
Tel: (92-21) 2633151-2639581
Fax:(92-21)2638086

UrduDost.com

UrduDost Library

**انتساب:**

اپنی شریکِ حیات

**ثمرین**

کے نام!

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| ذاتی مکالمہ | ڈاکٹر سید سعید نقوی | ۵ |
| ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانے | قمر علی عباسی | ۸ |
| ان کی کہانیوں کی فضا مشرقی ہے | امجد اسلام امجد | ۱۱ |
| ۱۔ تتلی تماشا | | ۱۳ |
| ۲۔ جنگل کا قانون | | ۱۸ |
| ۳۔ کالی آندھی | | ۲۳ |
| ۴۔ زود پشیمان | | ۳۳ |
| ۵۔ سراب | | ۴۰ |
| ۶۔ جگ بیتی | | ۴۶ |
| ۷۔ ہم جولی | | ۵۰ |
| ۸۔ ابدی کھیل | | ۵۵ |
| ۹۔ آخرِ شب | | ۶۰ |
| ۱۰۔ دین کے محافظ | | ۶۵ |
| ۱۱۔ بغاوت | | ۷۱ |
| ۱۲۔ بندگلی | | ۷۹ |
| ۱۳۔ موٹا | | ۸۴ |
| ۱۴۔ تعویذ | | ۸۹ |
| ۱۵۔ بھرم | | ۹۸ |
| ۱۶۔ گوارن | | ۱۰۴ |
| ۱۷ دلدل | | ۱۱۲ |
| ۱۸۔ معکوس | | ۱۲۲ |

# ذاتی مکالمہ

بعض بیج ایسے ہوتے ہیں جو ناموافق زمین اور اجنبی فضا میں بھی اپنے نمود کا سفر مکمل کر لیتے ہیں۔ اجنبی زمین میں بھی اگر یہ تخم مناسب آبیاری پا جائے تو یہ ایک سایہ دار تناور درخت بن سکتا ہے۔ ادبی تخلیق بھی ایک ایسا ہی عمل ہے۔ ہر چند کہ میں نظم ونثر دونوں اصنافِ سخن کا بچپن سے مودب طالب علم رہا ہوں۔ خود لکھنے کا حوصلہ عمر کی چوتھی دہائی میں نیویارک کی سنگلاخ زمین سے پیدا ہوا۔ چیزوں کو جس طرح دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا، انہیں کہانی، Fable اور افسانوں کی شکل میں تبلیغ کیا۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کا فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔

تعجب یہ نہیں کہ میں نے اتنی تاخیر سے لکھنا کیوں شروع کیا، حیرت یہ ہے کہ ہر آدمی کہانی گو اور افسانہ نگار کیوں نہیں۔ ہمارے اطراف تجربوں، حادثوں، ظلم واستبداد، سخاوت ومہربانی، سفاکی وسنگ دلی، ریاوفریب اور بےغرضی وقربانی کی لاتعداد کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ جو ہماری زندگی کے مجسمے کو ہر لمحہ ایک نئی تراش دیتی ہیں۔ لگتا ہے انسان کو نامعلوم حوادث اور اَن دیکھے امکانات کے سمندر میں بلا پتوار وبادبان کشتی پر سوار کر کے چھوڑ دیا ہے۔ وائے نادانی کہ اپنے تئیں ہم اپنی سمت سے واقف ہیں، ہمیں اپنے اسباب پر بھروسہ ہے اور بہ ظاہر یہ کشتی اپنے رہوار کے زیرِ اثر ہے لیکن دراصل یہ کشاں کشاں ایک منجدھار میں بہائے لیے جا رہی ہے۔

''ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی''

اس سفر میں جو سب پر گزری، وہی ہم پر بھی گزری ہے۔ گاہے کم گاہے زیادہ۔ لیکن خدا اوسط برقرار رکھتا ہے۔ آپ ان تمام کہانیوں سے بہ خوبی واقف ہیں کیونکہ یہ آپ کے اردگرد کے





واقعات ہیں۔ کہانی گو اور قاری میں فرق صرف حسیات اور بیانیہ کا ہے۔ یہ کہانیاں جو آپ کے روز مرہ کا حصہ ہیں... شاید آپ نے انہیں کسی اور رخ سے محسوس کیا یا معاملے کو غیر اہم جان کر نظر انداز کر کے گزر گئے۔ کہانی گو اسی لمحے کو دہراتا ہے۔ اس کے مختلف پہلو اجاگر کرتا ہے۔ آپ کی حسیات کو برماتا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ امکان غالب ہے کہ یزداں نے کسی شوخ لمحے میں انسان کو زمین پر اُتار کر ایک دل چسپ کھیل کی ابتدا کی ہے اور اب اپنی تخلیق کے متنوع رنگوں اور پہلو دار شخصیت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ خود انسان پر اس سفر میں کیا گزری ہے۔ آغاز تو لکھ دیا ہے... انجام کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔

رہروئے راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

ہر فن کار کا فن اس کے دور اور اس کے اطراف کا آئینہ ہوتا ہے۔ جو دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے، بیت رہی ہے، وہی تو بیان ہوگا۔ داخلی حسیات اور خارجی تجربات مل کر افسانہ بنتے ہیں۔ خارجی تجربات ماحول، معاشرے اور زبان سے منسلک ہیں۔ ہمارا سماج اور معاشرہ اس وقت اہم کش مکش سے دوچار ہے۔ معاملہ خواہ حقوقِ نسواں کا ہو یا آزادیِ اظہار کا۔ بات معاشی ناہمواری کی ہو یا طبقاتی تناؤ کی۔ ذکر مذہبی انتہا پسندی کا ہو یا اجتماعی جنوں کا۔ ہمارا معاشرہ اس وقت اس بھٹی میں تپ رہا ہے جس سے بہت سی قومیں کندن بن کر نکلی ہیں اور کچھ راکھ ہو کر صرف تاریخ کی کتابوں کا حصہ بن گئیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے عہد کے شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، مصور، موسیقار اور ہدایت کار، غرض سب تخلیق کار اس کش مکش کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کریں تا کہ ہماری قوم اور معاشرہ اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکے۔ ہماری سوچ میں مختلف کو بدی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ جب کہ کائنات کا سارا حسن ہی تنوع اور اختلاف میں ہے۔ اس قسم کے مباحث اب ہمارے ارتقا کی ضرورت بن گئے ہیں۔

کراچی میں پیدائش کے بعد میرا بچپن حیدرآباد سندھ میں گزرا۔ والدین کے ادبی ذوق کی وجہ سے جہاں منٹو کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کی تمام کتابیں اوائل عمر میں ہی گھر میں پڑھنے کو مل گئیں، وہیں غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ اور فیضؔ سے تلامذہ کا موقع ملا۔ پطرس اور یوسفی سے بھی سیکھنے کا موقع ملا تو فسانۂ عجائب اور یادگارِ غالبؔ بھی دسترس میں رہی۔ والدین کی شرافت اور حسنِ سلوک مثالی ہیں۔ ان کی انسان دوستی نے غیر حسیاتی طور پر میری شخصیت میں وہ ادراک پیدا کیا جس سے

UrduDost.com

درونِ پردہ جھانکنے کا عمل سیکھا۔

طب کی تعلیم نے جہاں وقت کا خراج وصول کیا...وہیں انسانیت کے بعض وہ پہلو وا کیے جو شاید کسی اور شعبے میں دیکھنے کو نہ ملتے۔ طبی مصروفیات اور نگرنگر کے سفر نے اوّلاً ارتکازِ فکر سے محروم رکھا۔ نیویارک میں میری بیوی کی خالہ اور میری والدہ کی چچازاد بہن ڈاکٹر شہلا نقوی نے ادبی حلقوں سے باقاعدہ روشناس کرایا، شہلا خود ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار اور معروف شاعرہ ہیں۔ آزاد نظموں میں ان کا شمار زندہ شعرا کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری کی نہ صرف انہوں نے ہمت افزائی کی بلکہ راہ نمائی بھی کی۔

نیویارک میں قیام کے دوران جن دیگر احباب نے اپنی رائے سے نوازا اور اس راہ پر دھکیلتے رہے۔ ان میں جناب مامون ایمن، رئیس وارثی، ن م دانش، الطاف ترمذی، رفیع الدین راز اور شوکت فہمی کا شکرگزار ہوں۔ کسی شاعر یا افسانہ نگار کی شریکِ حیات ہونا ایک خاصہ امتحان کا مرحلہ ہے۔ میرے کئی شاعر دوستوں کی بیویوں کو شاعری سے قطعاً دلچسپی نہیں اور غالباً یہ ہی تضاد ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کا راز ہے۔ میری بیوی کی بدقسمتی کہ اسے اچھی شاعری اور اچھی نثر سے بہت شغف ہے۔ اس پس منظر میں میری ہر کوشش کی پہلی قاری ہونا اس کے لیے کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے، کچھ وہی بتا سکتی ہے۔ میں ثمرین کا بے حد مشکور ہوں کہ بہت حوصلے اور خندہ پیشانی سے تمام کہانیاں پڑھتی ہے اور اپنی صائب رائے دینے سے نہیں چوکتی۔ اس تمام ہنگامے میں ہماری زندگی میں دو چراغ جل اٹھے۔ مریم اور سارہ، میری توقعات سے زیادہ صالح۔ لیکن دونوں نے میری مصروفیت سے کچھ سبق نہیں سیکھا اور باپ کے نقشِ قدم پر شعبۂ طب میں ابتدائے سفر ہیں۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "نامہ بر" آپ کے ہاتھوں میں ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے اور میں اور آپ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں، اس کتاب کا سرورق میری بھانجی علینہ زیدی کے برش کی جادوگری ہے۔ سترہ سال کی عمر میں ذرا اس کی پختگی کا عالم دیکھیے، رنگ اور خطوط اس کے ہاتھوں میں خوب کھیلتے ہیں۔ علینہ نے کینوس کو اپنے ذریعۂ اظہار کے لیے منتخب کیا ہے، اللہ کرے زورِ برش اور زیادہ۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی

نیویارک



UrduDost Library

# ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانے

## قمر علی عباسی (نیویارک)

روزِ اوّل سے انسان کہانی سننے کا شوقین ہے، جیسے جیسے ترقی کی، اسی طرح کہانی نے بھی آگے بڑھنا شروع کیا۔ ایک زمانے میں یہ باقاعدہ ایک فن تھا، قصہ گو اہم سمجھے جاتے تھے۔ انسان ہمیشہ سفر میں رہا ہے۔ قافلے، کارواں اور انفرادی طور سے لوگ ایک علاقے سے دوسرے حصے میں گئے، پھر ایک ایسا دور آیا جس سفر کے دوران رات گزارنے کے لیے سرائے بنائی گئیں۔ یہ صرف قیام کرنے کی جگہ نہیں تھی، یہاں مختلف لوگ اپنی تہذیب، زبان اور ثقافت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے، دوردراز ملکوں کا احوال سنتے سناتے، رات آتی تو قصہ گو محفل سجاتے، یوں قصہ گوئی ایک بڑا فن بن گیا، جب زمانہ بدلا تو دنیا کی سب سے زیادہ مقبول کتاب "الف لیلیٰ" آئی جو ایک ہزار ایک راتوں کی کہانی تھی اور دنیا میں ہر جگہ، ہر زبان میں منتقل ہوئی، "طلسمِ ہوشربا" بھی کمال کی کتاب ہے، اس میں حسن، عشق، جادو، سب ہی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر علم سے پہلے طلسم آیا اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا اور آج بھی سحر متاثر کرتا ہے۔

جدید زمانے میں سفر کی سہولتیں ایسی ہوئیں کہ دنوں کا سفر گھنٹوں میں ہونے لگا۔ سرائے کی جگہ جدید آرام دہ اور بے شمار سہولتوں کے ساتھ ہوٹل بنائے گئے۔ قصہ گوئی نے بھی نیا رخ اختیار کیا۔ وہ افسانہ بن گیا۔ دنیا میں ہر زبان میں یہ نہ صرف پیدا ہوا بلکہ پسند بھی کیا گیا۔

اُردو زبان اپنے وجود کے آغاز سے ہی عربی، فارسی سے پیوستہ تھی اس لیے اس زبان کی روایات بھی شامل ہوگئیں۔ کہانی کہنے اور لکھنے کا رواج ہوا، جیسے جیسے زبان نے ادب کے خزانے جمع کرنے شروع کیے، ان میں افسانوں کے آب دار موتی بھی تھے۔ آزادی سے پہلے افسانہ لکھا جاتا تھا اور اس میں اس زمانے کے ماحول، حالات اور واقعات بولتے تھے۔ اس میدان میں بہت سے لکھنے والوں نے اپنے کارنامے دکھائے، افسانہ اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہا ہے اور آگے بڑھنے کی کوشش میں شاہ کار افسانے قارئین کو دیتا رہا ہے۔

امریکہ میں جو لوگ برصغیر سے آئے، اپنے ساتھ روایت، ثقافت اور زبان بھی لائے۔ فکرِ معاش کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رکھی۔ امریکہ اپنے وسائل اور علاقے کی مناسبت سے بڑا ملک ہے، پاکستان سے ہجرت کرنے والے جب یہاں آئے تو جہاں روزگار ملا، معاش کے مواقع حاصل ہوئے، وہیں کا رخ کیا۔ بڑے شہروں میں لوگ زیادہ آباد ہوئے۔

نیویارک امریکہ ہی نہیں دنیا کے بڑے شہروں میں ہے۔ یہاں صحافت، ادب، شاعری خوب پھولتی پھلتی ہے، محفلیں سجائی جاتی ہیں، اخبارات نکلتے ہیں، رسائل شائع ہوتے ہیں، کتابیں چھپتی ہیں، خاص طور سے افسانے امریکہ کے ہر شہر میں لکھے جا رہے ہیں۔ اس میں نامی گرامی نام بھی ہیں۔ ایک سمت لاس اینجلس میں انور خواجہ ہیں، شکاگو میں رضیہ فصیح احمد افسانے تحریر کرتی ہیں، ٹورنٹو میں سلطان جمیل نسیم ہیں، شکیلہ رفیق بھی خوب صورت پُر اثر افسانے تحریر کرتی ہیں، نیوجرسی میں آصف الرحمان طارق ہیں جو مسلسل ایسے افسانے لکھ رہے ہیں جو چونکا دیتے ہیں۔

نیویارک میں افسانہ نگاری کے میدان میں ایک اور نام اُبھرا ہے، یہ ڈاکٹر سید سعید نقوی ہیں۔ ہم نے ان کے افسانے پڑھے اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ ایسے موضوعات کو زیرِ بحث لاتے ہیں جن کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔

وہ سارے معاملات جو روزِ اوّل سے انسان نے پیدا کیے ہیں یا معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اس کے دامن میں بندھے ہیں، کبھی کبھی بات بہت چھوٹی سی ہوتی ہے مگر اسے بیان کرنے میں کمال ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سعید نقوی نے اپنے افسانوں میں ایسی باتیں بیان کی ہیں جو ہم سب محسوس کرتے ہیں لیکن اظہار کا ذریعہ ایسا نہیں ہوتا جو دیر تک سوچنے پر مجبور کرے۔ ان کے کردار شہروں میں، دیہاتوں میں ہیں، کھیتوں، کھلیانوں میں ہیں۔





افسانہ ''ہم جولی'' کی رانو ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اس کا باپ شادی طے کرتا ہے تو دولہا والے پندرہ سو روپے مانگتے ہیں، ان کی فرمائش پوری کرنے کے لیے وہ اپنی بھینس سولہ سو روپے میں بیچ دیتا ہے تو رانو سوچتی ہے کہ اس کی قیمت دنیا کے بازار میں ایک بھینس یعنی ایک جانور سے بھی کم ہے۔

''کالی آندھی'' نامی ایک اور افسانے میں دکھایا ہے کہ دیہات کی لڑکیوں کے اسکول کو کچھ لوگ بند کروانا چاہتے ہیں۔ استانی نہیں مانتی، اسے گولی مار دیتے ہیں۔ بہ ظاہر اسکول بند ہو جاتا ہے لیکن اندر کمرے کے ایک کونے میں اسکول کی سب سے ذہین لڑکی چند بچیوں کو تعلیم دے رہی ہے۔

''آخرِ شب'' میں ایک شخص اسپتال میں داخل ہے اور ان دنوں کو یاد کر رہا ہے کہ جب وہ صحت مند اور دولت مند تھا اور تکبر کا سلوک لوگوں سے کرتا تھا، اب اس کسمپرسی میں پچھتاوے کے کانٹے اسے کرب میں مبتلا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر سعید نقوی کے افسانے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کا مطالعہ، مشاہدہ وسیع ہے بلکہ کرداروں کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہے، وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جن میں تشبیہات، محاورے اور کہاوتیں ہوتی ہیں۔

ان کا ہر افسانہ اپنی جگہ ایک مکمل طنز اور معاشرے پر تنقید ہے۔ ڈاکٹر سعید نقوی انسانوں سے خطاب کرتے ہیں، انہیں وہ تصویر دکھاتے ہیں جو انہوں نے دیکھی ہوتی ہے مگر توجہ نہیں کی ہوتی۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانے آخرِ شب، ہم جولی، تپلی تماشا، جنگل کا قانون، ابدی کھیل، بغاوت، بھرم، کالی آندھی، پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک اُردو میں اتنے بھرپور افسانے لکھے جاتے رہیں گے، اس کا دامن کبھی بہار سے خالی نہیں رہے گا۔

☆☆☆☆☆

# ان کی کہانیوں کی فضا مشرقی ہے

**امجد اسلام امجد** (لاہور)

ڈاکٹر سید سعید نقوی کی کچھ کہانیاں وقتاً فوقتاً میری نظر سے گزرتی رہی ہیں، جن کا مجموعی تاثر خاصا خوش گوار تھا۔ اب جوان کے افسانوں کی کتاب (نامہ بر) کا مسودہ پڑھنے کا موقع ملا ہے تو ان کے اسلوب، موضوعات، فن اور نظریۂ فن کی ایک زیادہ بہتر اور نسبتاً جامع صورت سامنے آئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ Short story (جسے اُردو میں ہم افسانہ یا مختصر کہانی کہتے ہیں) کو انہوں نے سچ مچ شارٹ اسٹوری ہی کے طور پر دیکھا اور برتا ہے۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کہانی میں شاید ہی کوئی کہانی ایسی ہو جسے پڑھنے میں پندرہ سے زیادہ منٹ لگتے ہوں۔ کوزے کو دریا میں سمیٹنے کا یہ عمل دیکھنے میں جتنا بھی آسان نظر آتا ہو... حقیقت میں یہ کسی لکھنے والے کا بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔ یہ کم و بیش ناصر کاظمی کے اسی شعر سے ملتی جلتی بات ہے جس میں اس نے کہا تھا۔

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اخبار کے اداریئے بہت لمبے لمبے لکھا کرتے تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ اصل میں میرے پاس مختصر لکھنے کا وقت نہیں ہے۔





ڈاکٹر سید سعید نقوی کی ان مختصر کہانیوں کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ کم و بیش ان کی کسی بھی کہانی کا موضوع دہرایا نہیں گیا اور تیسری خوبی یہ ہے کہ بہت سی کہانیاں اگر نایاب نہیں تو انتہائی کم یاب موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ جیسے ''تتلی تماشا''، ''جنگل کا قانون''، ''کالی آندھی''، ''جگ بیتی'' اور ''ابدی کھیل''۔ ان میں سے ''جنگل کا قانون'' اور ''ابدی کھیل'' تو دو ایسی کہانیاں ہیں جن کی کوئی اچھی مثال اُردو افسانے کی تاریخ میں ابوالفضل صدیقی، آغا رفیق حسین اور کسی حد تک انتظار حسین کے علاوہ شاید ہی کہیں مل سکے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ مگر ان کی کہانیوں کی فضا سرتا سر مشرقی ہے۔ جن میں انسان دوستی اور طبقاتی تقسیم کے پیدا کردہ مسائل کو بڑی خوب صورتی اور ہنر مندی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے ابھی وہ سیکھنے کے مراحل میں ہیں لیکن ان کہانیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے طالب علم کی طرح اپنے سبق کو سمجھتے بھی ہیں اور یاد بھی کرتے ہیں۔ سوان کہانیوں کو اگر یہ لائسنس دے کر پڑھا جائے ''یہ ایک ایسے نئے افسانہ نگار کی کہانیاں ہیں جو بنیادی طور پر سائنس کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے'' تو شاید ہم مصنف اور اس کتاب سے صحیح اور واجب انصاف کر سکیں۔

UrduDost.com

# پتلی تماشا

مداری نے لکڑی کے فریم پر سے ملگجی سفید چادر اُتار کر تہ کرنا شروع کر دیا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ تھکا ہوا سورج بھی اپنی سفید اوڑھنی اُتار کر سیاہی کا لبادہ اوڑھ رہا تھا۔ زیادہ تر تماش بین جا چکے تھے۔ کچھ بچے اب بھی دل چسپی سے اسے سامان بٹورتا دیکھ رہے تھے، گویا یہ بھی تماشے کا ایک حصہ ہو۔ ساحل پر کچھ ٹوٹی ہوئی سیپیاں، خالی تھیلیوں اور جوس کے خالی ڈبوں کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ سڑک سے ساحل کو علاحدہ کرنے کے لیے تقریباً تین فٹ اونچی دیوار حدِ نظر تک چلتی گئی تھی۔ اسی منڈیر پر پچھلے بیس سال سے مداری اپنی کٹھ پتلیوں کا تماشا دکھا رہا تھا۔ ہر روز تین بجے سے سورج ڈھلنے تک اور چھٹی کے دن صبح نو بجے سے شام کے جھٹ پٹے تک۔ اس کا کھوکھا بھی ریت، پانی، سڑک اور دیوار کے ساتھ اسی منظر کا ایک حصہ بن چکا تھا۔

تماشا کرنے والے نے چادر اُتار کر تہ کی اور سائیکل کے پیچھے لگی صندوقچی میں رکھی۔ ڈوریاں ایک رِیل پر لپیٹیں۔ یہ رِیل پہلے کبھی مانجھا لپیٹنے کے کام آتی تھی۔ کوئی منچلا ساحلِ سمندر پر چھوڑ گیا تھا۔ مداری کے ہاتھ لگی تو اس کا روز روز کا ڈوری اُلجھنے کا مسئلہ حل ہوا۔ ڈوریاں لپیٹ کر اس نے کٹھ پتلیوں کو سنوارا۔ پیلی ملکہ اس کی خاص دُلاری تھی۔ اس پر کالے دھاگے سے بال بنائے گئے تھے، انھیں سنوار کے ٹھیک کیا۔

''چلو اب لیٹ جاؤ، تھک گئی ہوں گی، سارا دن ناچ ناچ کے۔'' مداری ساتھ ساتھ اپنی کٹھ پتلیوں سے باتیں کرتا رہتا۔ پیلی ملکہ کے بعد اس نے دلاّ رام، چاندنی، دلربا اور بوا کو بھی لٹایا لیکن



UrduDost Library

کسی کے حصے میں پیلی ملکہ جیسا پیار اور محبت نہیں آئی۔ پیلی ملکہ کے سبھاؤ اور رچاؤ کی بات بھی کچھ اور تھی۔ ستاروں سے ٹکا پیلا لہنگا، اس پر شوخ سرخ بلاؤز۔

لکڑی کے فریم کے پیچھے کھڑا مداری، کٹھ پتلیاں ایسی نچاتا کہ مانو خود سے ناچ رہی ہیں۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی کا اشارہ کٹھ پتلی کے جسم میں گویا حرارت بھر دیتا۔ انگوٹھے کی جنبش سے کٹھ پتلی کا سر مٹکنے لگتا۔ درمیانی انگلیوں سے کٹھ پتلیوں کے نچلے دھڑ ملتے تھے۔ ساتھ ساتھ مداری کی نیم نثری نیم نظم بیانیہ بھی چلتا رہتا۔

''آج دربار ہمارا خالی ہے، بادشاہ سب کا والی ہے۔''

ساتھ ساتھ مجمع کنٹرول بھی ہوتا رہتا۔

''شاباش بچو پیچھے ہو جاؤ۔ دو دو قدم پیچھے کی جانب، صاحبان دو قدم''

''پیلی ملکہ رانی ہے، دلاّ رام اس کی باندی ہے۔

بادشاہ جب بھی آتا ہے، دلاّ رام کو نچاتا ہے۔''

ہر ایک گھنٹے بعد مداری نیا تماشا شروع کرتا جو تقریباً چالیس منٹ جاری رہتا۔ دن ڈھلنے تک اس کی انگلیاں دکھنے لگتیں۔ پوریں اس کے اشارے پر چلنے سے انکار کر دیتیں اور وہ زور لگاتا تو کبھی کوئی پتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ اپنے بیان میں اس حادثے کو بھی شامل کر دیتا۔ جس دن سارے تماشے بغیر کسی غلطی کے ختم ہوتے، اس دن مداری پھولے نہ سماتا۔ کٹھ پتلیوں کو پیار سے سنوارتا، اُٹھانے میں احتیاط، رکھنے میں پیار، جیسے کپڑے کی نہیں کانچ کی بنی ہوں۔ آج بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ اس نے بہت فخر سے تماشائیوں کو کٹھ پتلیاں پیش کی تھیں۔ بنی بجی کٹھ پتلیوں کو لوگ داد دیتے تو اسے اپنی ملکیت پر غرور ہونے لگتا۔

سامان بٹور کے وہ سائیکل پر بیٹھا اور تیزی سے پیر مارتا جھگی کی طرف چل پڑا۔ ساحل سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر مچھیروں کی بستی تھی۔ اس میں منت سماجت کر کے اس نے بھی ایک کمرے کی جھگی حاصل کر لی تھی۔ سائیکل کو کونے میں کھڑا کر کے رومال میں بندھے پکوڑے آلتی پالتی مار کے باسی روٹی سے کھانے بیٹھ گیا۔ لقمہ منہ میں ڈال کر کچھ خیال آیا تو پیلی ملکہ کو صندوق سے نکال لایا اور ساتھ بٹھا لیا۔

''آج تو خوب ناچی ہے، واہ بھئی واہ۔ اسی خوشی میں اب تیرے گلے میں ایک سیپیوں کا ہار بھی ڈالوں گا۔ بہت سندر لگے گی۔'' مداری نوالوں کے درمیان اپنی کٹھ پتلی سے والہانہ گفت گو

میں مشغول تھا۔

''نہ بھئی یہ دلآ رام، چاندنی وغیرہ کو میں یہاں نہیں بٹھاتا۔ ان کی سفارش نہ کر۔ ان کا بھی وقت تھا۔ اب ان میں تجھ جیسی بات نہیں رہی۔'' مداری نے گویا پیلی ملکہ کا منہ بند کر دیا۔

کھانا کھا کے جھگی سے باہر نکل گیا۔ اکثر سونے سے پہلے ایک دو گھنٹے مچھیروں کے ساتھ مل کر بیڑی یا حقے کا دور چلتا۔ کبھی کوئی دیسی ٹھرّا ابھی لے آتا تو سمجھو وہ رات اور لمبی ہو جاتی۔ اسی حقے اور ٹھرّے کے درمیان بستی کے معاملات طے ہوتے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا احوال پوچھا جاتا۔ پولیس اور بدمعاشوں کے بھتوں کا ذکر ہوتا۔ ان دو گروہوں کے تذکرے اکثر اتنے ملتے جلتے ہوتے تھے کہ دونوں میں تمیز مشکل ہو جاتی۔ ساحل پر سیر کے لیے آنے والوں کے لطیفے اور چٹکلے بیان ہوتے۔ غرض خوب محفل جمتی۔ آج بھی مداری اس ہوہا میں شامل رہا۔ کوئی رات نو بجے کے بعد جھگی واپس آیا۔ پلنگ پر کھیس بچھا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آئی تو اُٹھ کر پیلی ملکہ کو بستر پر ساتھ لٹا لیا۔

دوسرا دن بھی ویسا ہی تھا... روزانہ جیسا۔ لیکن آج ہوا کل کے مقابلے میں زیادہ تیز چل رہی تھی۔ فریم پر کپڑا اچڑھانے میں خاصی دشواری ہوئی۔ آج اس کی کہانی بھی اتنی روانی سے نہیں چل رہی تھی۔ کٹھ پتلیاں اس کے اشاروں پر غلط سلط ناچ رہی تھیں۔ ایک دفعہ جب دلآ رام کو پیلی ملکہ کو سلام کرنا تھا تو غلطی سے دلآ رام کے ہاتھ کی جگہ پیر اُٹھ گیا۔ اس پر کچھ تماش بین ہنس پڑے۔ مداری کا منہ سرخ ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ پردے کے پیچھے کھڑے ہونے کی وجہ سے تماش بین اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ آج کا دن ہی کچھ ایسا تھا۔ ہر کھیل میں کچھ نہ کچھ غلطی ہوتی گئی۔ سہ پہر کو تو حد ہو گئی۔ ہوا کے زور سے پیلی ملکہ کا بلاؤز اُتر گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کچھ منچلوں نے سیٹیاں مارنی شروع کر دیں۔ کچھ نے خوب تالیاں بجا بجا کر آوازے کسے۔ مداری کو پردے کے سامنے آ کر اس کا بلاؤز ٹھیک کرنا پڑا۔ جیسے تیسے کر کے دن تمام ہوا۔ مداری نے چادر تہ کر کے صندوق میں رکھی۔ کٹھ پتلیوں کو غصے سے پھینک پھانک کے صندوق میں بھرا، اور سائیکل پر سوار یہ جا وہ جا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے لوگ ابھی تک اس کی ہنسی اُڑا رہے ہوں۔ سائیکل پر پیر اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ عام حالت میں کوشش بھی کرتا تو اتنی تیزی نہ آتی۔ جھگی میں گھستے گھستے سائیکل زمین پر گر پڑی۔ اسے اُٹھانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ کٹھ پتلیوں کو صندوق سے نکال کر اِدھر اُدھر پھینکا اور پیلی ملکہ کو دھنکنا شروع کر دیا۔





''تو جان بوجھ کر میرا کھیل خراب کرتی ہے تاکہ میری ہنسی اُڑے۔ کم بخت کے گویا جسم میں جان نہیں ہے۔ جہاں ہاتھ اُٹھاتا ہوں، وہاں پاؤں اُٹھ رہے ہیں۔ کسی اور کا بلاؤز اُترتا تو وہ چلّو بھر پانی میں ڈوب مرتی۔ پر تیرے چہرے پر شرم یا ملال کا کوئی نام نہیں۔''

مداری نے پیلی ملکہ کا ہاتھ اس زور سے کھینچا کہ دھاگے ادھڑ گئے اور ہاتھ بقیہ جسم سے علاحدہ ہو گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ گویا سکتے میں آ گیا ہو۔ مگر پھر ایسی لات ماری کہ کٹھ پتلی حجرے کے دوسرے کونے میں جا گری۔ غصے سے بستر پر لیٹ گیا۔ آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ باہر چوپال پر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ حالاں کہ باہر سے رامو نے آواز بھی دی مگر یہ سوتا بن گیا۔

صبح ہونے تک مداری کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو چلا تھا۔ آج اس نے چاندنی پر زیادہ توجہ دی اور بنا سنوار کے اسے تیار کیا۔ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے قریب اور دور سے دو چار دفعہ دیکھا۔ اہتمام سے مطمئن ہوا تو چوم کر صندوق میں رکھ لیا۔ پیلی ملکہ رات سے اسی کونے میں پڑی تھی۔ مداری نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی۔ صندوق سائیکل پر رکھ کر چل پڑا۔ آج کا دن خوب تھا۔ ایک تو یہ کہ روز نئے تماش بین ہوتے ہیں... جنھیں کل کے حادثوں کی خبر نہیں تھی۔ سب کھیل ایک ایک کر کے اطمینان سے تکمیل کو پہنچے۔ مداری پھر موج میں تھا۔ شام ہونے پر پیسے سمیٹے۔ سفید چادر تہ کر کے رکھی اور چاندنی کو بہت پیار سے صندوق میں اُتارا۔

''پیلی ملکہ کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ سمجھتی تھی اب اس کے بغیر کھیل چل نہیں سکے گا۔ پر تجھے بھول گئی تھی وہ۔ تو نے تو آج کمال ہی کر دیا۔ واہ بھئی واہ۔''

مداری اب چاندنی سے خوش تھا اور خوب باتیں کرتا جاتا۔ حجرے میں پہنچ کے سائیکل قرینے سے کھڑی کی۔ راستے سے دال، پیاز اور روٹی لے لی تھی، انھیں ایک رکابی میں رکھا اور چاندنی کو ساتھ بٹھا کے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ کھانا کھا کے اس کی نظر پیلی ملکہ پر پڑی۔ اسے اُٹھا کر جھاڑا۔ پیلی ملکہ کا بازو بھی تلاش کیا اور پٹاری سے سوئی دھاگا لے کر بازو شانے سے جوڑنے کے ارادے سے پیلی ملکہ کو اُٹھایا تو اس کی ٹانگ بھی زمین پر گر پڑی۔ اب مداری کو کچھ افسوس ہوا۔ اُلٹ پلٹ کے دیکھا، بہت کوشش کی کہ بازو اور ٹانگ دوبارہ لگ جائیں مگر وہ کچھ اس انداز سے ادھڑے تھے کہ اب دوبارہ لگنا ممکن نہیں تھا۔ اسی تگ و دو میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اب مداری بے چین تھا کہ کسی طرح اپنی دلاری کو واپس صحیح حالت میں لا سکے مگر کل کے غصے میں وہ کچھ زیادہ

ہی آگے نکل گیا تھا۔ تھک ہار کے اُٹھا اور پیلی ملکہ کو اس کے بازو اور ٹانگ کے ساتھ لے کر جھگی سے باہر نکل آیا۔ بستی کیا تھی، ایک خالی پلاٹ پر تقریباً بیس جھگیاں بکھری پڑی تھیں۔ کونے میں ایک نیم کا درخت سر اُٹھائے کھڑا رہتا تھا۔ مداری نے اس کے نیچے تھوڑی سی زمین کھودی اور پیلی ملکہ کا دھڑ، بازو اور ٹانگ اس میں دبا کے مٹی برابر کر دی۔ مرے مرے قدموں سے جھگی میں واپس آیا۔ بستر ٹھیک کرنے کا بھی حوصلہ نہ تھا۔ چاندنی کو اُٹھا کے ایسے سینے سے لگایا گویا کٹھ پتلی کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہو۔ اسی حالت میں بستر پر لیٹ گیا اور آپ ہی آپ رونے لگا۔

☆☆☆☆☆





# جنگل کا قانون

’’پروں کو میں اپنے سمیٹوں یا باندھوں...... پروں کو میں اپنے سمیٹوں یا باندھوں‘‘ اسی گنگناہٹ میں مگن وہ جنگل کے اندر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ کانٹوں سے دامن بچاتی، اِدھر ہریالی پہ منہ مارا ...اُدھر پھولوں پہ چکھ ماری۔ جوانی کا عالم ایسا ہی اندھا ہوتا ہے۔ آج صبح تالاب میں اپنا روپ دیکھ کے وہ خود شرما سی گئی تھی۔ مورنیاں تو جنگل میں اور بھی کئی تھیں۔ لیکن اس پر جوبن ایسے ٹوٹ کر آیا تھا جیسے دلہن کو سنگھار کرنا آ گیا ہو۔ صراحی دار گردن، بھری بھری ٹانگیں، پر ایسے بڑے کہ ایک ایک پر پنکھا جھلنے کے کام آئے۔ ہر پر کے عین وسط میں ایسا خوب صورت رنگین دائرہ جیسے کسی ماہر نقّاش نے کاشی کاری کا مقابلہ جیتنا ہو۔ اس بھرپور جوانی پر نزاکت اور انداز، شوخی اور دل ربائی، قیامت کے آثار تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ جنگل کا کوئی حصہ خودرو جھاڑیوں اور درختوں سے آزاد نہیں تھا۔ درختوں سے آکاس بیلیں یوں لپٹیں تھیں گویا خون چوس کر ہی چھوڑیں گی۔ ایسے میں مشکل سے چار فٹ کا صاف ٹکڑا کیا نظر آیا۔ اس نے اپنے پر پھیلائے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔ جیسے پیا کی آمد اسی رقص سے متصل ہے۔ اپنے گرد و نواح میں منڈلاتے خطرات سے بے خبر، نوجوان رقص۔

تینوں لکڑ بھگوں نے جو اس کو محوِ رقص دیکھا تو درختوں کے پیچھے چھپنا ضروری جانا۔ وہ بہت دیر سے اس کا پیچھا کر رہے تھے اور مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ آنکھیں ہوس سے لال تھیں۔ ذہن کے دریچوں پر ممکنہ لذت نے تالے ڈال دیے تھے۔ اب وقت مناسب تھا۔ دور دور کسی اور پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ قریب ترین جوہڑ بھی کم از کم سو چھلانگ دور تھا۔ شکار بند آنکھوں سے محوِ رقص تھا۔ ایسے میں شیطان سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا اور تینوں لکڑ بھگوں نے رقاصہ کے گرد رقص شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے دائرہ تنگ کرتے گئے۔ لکڑ بھگے شیر کو دیکھ چکے تھے کہ کیسے اپنے شکار کو ہوا میں اُچھالتا ہے، اس سے کھیلتا ہے، فوراً مار نہیں دیتا۔ آخر یہ شیروں کے کھیل ہیں۔ لکڑ بھگے بھی اسی ہراس سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ ان کے قریب آنے سے مورنی کے

UrduDost.com

اطراف کی خوشبو ہی بدل گئی۔ فضا میں اچانک خطرے کی بو رچ گئی۔ سہم کر مورنی نے ناچ روکا اور اطراف میں نگاہ ڈالی تو دنیا اندھیری ہوگئی۔ حالاں کہ اطراف کے درختوں سے چھن چھن کر سورج کی روشنی نے خاصا اجالا کیا ہوا تھا۔ لیکن آنے والے خطرے کے خوف نے اس کے ذہن کو تاریک کر دیا تھا۔ مورنی نے ہزار منتیں کیں، واسطے دیے، جنگل کے قانون کا حوالہ دیا، نتائج کا حوالہ دیا مگر لکڑ بھگوں کے کانوں میں اس کی چیخیں سریلے نغموں کی مانند اُتریں۔ تین لکڑ بھگوں کے سامنے اس کی مزاحمت کتنی دیر چلتی۔ ذرا سی دیر میں اس کے پر نچ چکے تھے، سر کا تاج اُتر گیا تھا۔ جسم میں جیسے درندگی اور زیادتی کا زہر دوڑنے لگا۔ لکڑ بھگے اپنا گوہرِ مقصود پا کے باچھوں سے رس پونچھتے کب کے غائب ہوگئے۔ مورنی نے اپنے حواس جمع کیے۔ اطراف میں بکھرے پروں اور ننگے سر کو دیکھا تو اور مردنی سی ہوگئی۔ چال سے وہ اَلھڑ پن جو کنواریوں کا خاصا ہے، گم ہوگیا۔ آہستہ آہستہ اس کا احساسِ زیاں غصے اور انتقام کے جذبے میں ڈھلنے لگا۔ جنگل کا آخر ایک قانون تھا۔ یوں دن دہاڑے اس سے آگے اس سے سوچا نہ گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی ادھیڑ بُن میں اُٹھی اور ایک نئے عزم کے ساتھ شیر کی مچان کی طرف چل پڑی۔ جوہڑ کے اس پار مست ہتھنی اپنے سونڈ میں پانی بھر بھر کر اپنے بچوں پر ڈالتی اور خود ایسے نہال ہوتی جیسے یہ ٹھنڈک اسے خود پہنچ رہی ہو۔ مورنی کی مردنی چال سے ہتھنی نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کیا۔ پانی کا کھیل رک گیا۔ حالاں کہ مورنی کو دیکھ کے ہی ہتھنی نے سب معاملہ بھانپ لیا تھا۔ لیکن پھر بھی تفصیل سے مورنی کی بپتا سنی۔ ہتھنی کا جنگل میں مقام وہ تھا کہ لکڑ بھگے خود اس سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن اکیلی ہتھنی ان تین نامرادوں کا مقابلہ نہ کر پاتی اور پھر مورنی کی عزتِ نفس کی بحالی اسی میں مضمر تھی کہ وہ خود قانون کا سہارا لے اور لکڑ بھگوں کو قرار واقعی سزا دلوائے۔ ہتھنی کے ہمت بڑھانے سے مورنی نے جنگل کے شمالی خطے کا رخ کیا۔ شیر کی کچھار میں بہ راہِ راست باریابی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ جنگل کا قانون اپنے ڈھب کے مطابق چلتا اور عموماً بندر ایسے مقدمے شیر کے حضور میں پیش کرتے۔ بندر عموماً جنگل کے شمالی خطوں میں بسیرا کرتے تھے۔ جہاں لومڑی، لکڑ بھگے، بجو وغیرہ زیادہ تعداد میں پائے جاتے۔ زیادہ تر مقدمے ان ہی جانوروں کے اردگرد گھومتے۔ بندر جو اپنی عقل مندی کی بناء پر جنگل میں اعلیٰ طبقاتی مراعات کے حامل تھے، وہیں پائے جاتے۔ جہاں کاروبار میں گرمی کا رجحان ہو، مغربی خطے جہاں چیتے، ہاتھی اور شیر وغیرہ کا عمل دخل زیادہ تھا، عموماً بندروں کے کاروبار میں مندی رہتی۔ اس طبقاتی و معاشرتی فرقہ واریت نے



UrduDost Library

ایک درمیانی حصہ بھی پیدا کیا تھا۔ وسط جنگل، جہاں مورنی، ہرن، نیولا اور نیل گائے وغیرہ کا بسیرا تھا۔ یوں تو وسط جنگل سب سے پُرسکون علاقہ تھا لیکن دونوں مغرب اور مشرق کے جانور اپنا اپنا شکار وسط جنگل سے ہی حاصل کرتے۔ صرف طریقۂ واردات اور سنگینیٔ جرم مختلف ہوتی۔

مورنی کی قسمت کہ ایک قد آور بندر اسے شمالی جنگل کی بیرونی سرحد پر ہی مل گیا۔ بندر نے ایک نگاہ ڈالی اور معاملے کی بنیاد تک پہنچ گیا۔ بندر کا دل اس زیادتی سے خون ہوگیا۔ وہی مورنی جو کل تک اَلھڑ پن اور معصومیت کا نمونہ تھی، آج معصیت کا تازیانہ۔ بندر اسی وقت مورنی کو ساتھ لے کر شیر کی مچان کی طرف چل پڑا۔ تمام راستے مورنی کو مقدمے کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ مورنی کے چلن اور بناؤ سنگھار کے بارے میں ممکنہ سوالات سے معاملے کی نئی راہیں سجھائیں۔ سوچ کی سمت اور حالات کے ممکنہ مدّ و جزر نے مورنی کے انتقامی جذبے کی آگ پر کچھ پانی کا سا کام کیا لیکن اپنا عزم نہ چھوڑا۔

شیر کی مچان تک پہنچتے پہنچتے ایک چھوٹا سا قافلہ تیار ہوگیا تھا۔ ہتھنی، مورنی اور بندر کے علاوہ نیل گائے اور ایک ہرنی بھی ساتھ ہوئی۔ جو آج مورنی کے ساتھ ہوا ہے کل ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ سب کے ذہن میں ہی خدشہ سر اُٹھا رہا تھا۔ شیر نے آج دو زیبرے شکار کیے تھے۔ بھرے پیٹ کے ساتھ قیلولے کا مزہ کوئی ان سے پوچھے جو یہ عیاشی کر سکتے ہوں۔ قیامت سے کم کوئی شے شیر کو قیلولے سے نہیں نکال سکتی تھی اور مورنی کے ساتھ جو ہوا وہ شیر کے نزدیک دور دور تک قیامت نہ تھا۔ بندر کی تقریر، مورنی کی التجائیں سب کے جواب میں ایک غضب ناک دھاڑ، سب واویلے بند ہوگئے۔

چوں کہ معاملہ عجلت طلب ہے اس لیے مابہ دولت اس مقدمے کی سماعت کے فرائض بوڑھے لومڑ پر چھوڑتے ہیں۔ وہ عاقل ہے اور تجربہ کار بھی ہے۔ یاد رہے اس کا فیصلہ ہمارا فیصلہ ہوگا اور ہمارا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ شیر کی دھاڑ نے باقی جانوروں کے اوسان خطا کر دیے۔ لکڑ بھگوں کو پیغام دو کہ حاضر ہوں۔ مقدمہ یہیں ہماری مچان کے باہر طے ہوگا۔ لومڑ ہمارا نمائندہ ہے لیکن ہمیں ہرگز تنگ نہ کیا جائے۔ جنگل کے بادشاہ نے اپنے تئیں سستا اور فوری انصاف مہیا کر دیا۔

تینوں لکڑ بھگے حاضر ہوئے۔ لومڑ نہایت متانت اور سنجیدگی سے اسی برگد کے نیچے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ چوڑے چکلے تنے کے دوسری طرف شیر قیلولہ کر رہا تھا۔ مورنی کا مقدمہ بندر نے نہایت موثر پیرائے میں پیش کیا۔ ہرنی اور نیل گائے اپنے آنسو روک نہ سکے جس پر لکڑ بھگوں

نے اعتراض کیا کہ اس سے غیر منصفانہ ماحول پیدا ہو رہا ہے اور جانوروں میں مورنی کے لیے ہم دردی کے جذبات اُبھر رہے ہیں۔ بندر کے سخت احتجاج کے باوجود لومڑ نے باقی جانوروں کو واپس جانے کی ہدایت کی اور باقی کارروائی گھنے درختوں کے پیچھے علاحدگی میں ہوئی۔

لکڑبھگوں نے اقبالِ جرم سے انکار کیا۔ سینکڑوں جانور ہیں، اسے کیا معلوم کہ وہ لکڑ بھگے تھے۔ اگر اس نے دیکھا کہ لکڑ بھگے تھے تو اس کا مطلب ہے اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ خطرے کو دیکھ سکتی تھی۔ پھر بھاگی کیوں نہیں اور اگر مان لیں کہ لکڑ بھگے تھے بھی تو کیسے پتا چلے کہ یہی تین تھے؟ اور جنگل کے بیچ رقص کا کیا مقصد؟ یقیناً اس نے لکڑبھگوں کو آگے دیکھ کر آنکھیں موند لیں اور رقص شروع کر دیا تا کہ اپنی اندھی جوانی کا بندھن بھر سکے۔ توبہ...توبہ، ایسا کلیوگ۔ لکڑبھگوں نے پھر اپنے ثبوت میں شمالی جنگل کے مزید جانوروں کو پیش کیا۔ یہ جانور یہ تو نہ بتا سکے کہ واردات کے وقت لکڑ بھگے کہاں تھے مگر انھوں نے مورنی کی چال ڈھال، اس کی آراستگی اور شوخی، کچھ ایسے بیان کی جیسے مورنی نہ ہو کسی کسبی کا ذکر ہو۔ پھر یہ کہ کوئی بھی شریف مورنی دن دھاڑے اکیلے وسط جنگل میں بھلا رقص کرے گی؟ یہ یقیناً دوسرے جانوروں کے خون میں اُبال لانے کے بہانے ہیں۔ ایسے میں ان جانوروں کا کیا دوش جن سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ لکڑبھگوں کے دلائل ایسے نپے تلے اور تنک تھے کہ فوراً ہرنی اور نیل گائے شبہے میں پڑ گئے کہ کون سچ کہہ رہا ہے؟ ہتھنی کے تاثرات سے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا گھوم رہا ہے۔ مورنی بالکل سفید پڑ چکی تھی اور اگر بندر بڑھ کر سہارا نہ دیتا تو شاید وہ بے ہوش ہو جاتی۔

''جنابِ عالی! ہم آپ کے پڑوسی ہیں۔ ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔'' لکڑ بھگے، لومڑ کو نہ جانے کیا پیغام دے رہے تھے۔ لومڑ کے چہرے پر اب تک گومگو کے تاثرات تھے۔ لیکن اس جملے نے مقدمے کا رخ لکڑبھگوں کے حق میں موڑ دیا۔ اس نے باری باری دونوں، بندر اور مورنی سے سوال کیا کہ اگر ان کے پاس کوئی چشم دید گواہ ہے تو پیش کریں۔ جنگل کے قانون کے حساب سے اس قسم کے مقدمات کی سزا ملزم کو شیر کی مچان میں ملتی تھی۔ چند چیخوں کے بعد معتوب جانور جنگل کے بادشاہ کی خوراک کا حصہ بن جاتا۔ لیکن سزا مشروط تھی...چار چشم دید گواہوں کے بیان پر!

''جناب لومڑ صاحب! اس اندہ ناک واقعے کے گواہ خود یہ تین لکڑ بھگے ہیں اور چوتھی مورنی۔'' بندر نے اپنی سی آخری کوشش کر ڈالی۔ ''تینوں لکڑ بھگے اس واردات سے انکاری ہیں۔ اس صورتِ حال میں کوئی گواہ موجود نہیں۔ مزید یہ کہ شمالی جنگل کے جانوروں کے بیان کے مطابق





مورنی کا چلن اشتباہ کا باعث ہے۔ ایسے میں یہ عدالت لکڑبھگوں کو باعزت بری کرتی ہے۔''

پتا نہیں مورنی نے فیصلہ سنا بھی یا نہیں۔ وہ موجود تو ضرور تھی لیکن سماعت پر سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا۔ وہ مڑی اور وسط جنگل میں اپنے قبیلے کی طرف چل پڑی۔ جانور یوں دونوں طرف چھٹ گئے جیسے اس سے چھو گئے تو مٹی ہو جائیں گے۔ مورنی ان کے درمیان سے یوں گزر گئی جیسے ایک صدائے خامشی سے اس نے سمندر کے بیچ اپنے لیے راستہ بنا لیا ہے۔ موروں کی رہائش وسط جنگل کے ایک پسماندہ علاقے میں تھی۔ موروں ہی کے پروں سے اکثر چھپّر تانے گئے تھے تا کہ بارش اور دھوپ کی شدت سے بچ سکیں۔ مورنی کو اس جگہ سے بہت محبت تھی۔ بچپن سے جوانی تک کا سفر یہیں طے ہوا تھا۔ موروں کے اس گروہ نے ہمیشہ اسے خطروں سے بچایا۔ وہ بھی ان کے دکھ درد کی ساتھی تھی۔ اسی میں اس کے خاندان کے دوسرے مور بھی شامل تھے۔ لیکن جنگل کے اس علاقے کی معاشرتی ترکیب کچھ یوں ہے کہ پیدائش کے بعد پورا گروہ ایک خاندان بن جاتا ہے۔

آج بھی یہی جگہ مورنی کی آس اور ٹھکانہ تھی۔ جیسے جیسے وہ جھنڈ کی طرف بڑھتی گئی، ایک خوف ناک سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ عموماً جھنڈ مورنیوں کی صداؤں سے گونج رہا ہوتا۔ جوان مورنیوں کا رقص، موروں کے کھیل، بچوں کی کل کاریاں، کوئی وقت ایسا نہ ہوتا کہ یہاں خاموشی کا قیام ہو۔ لیکن اسی جگہ پر آج قیامت کا سکوت تھا۔ جیسے جھنڈ بالکل خالی ہو اور پوری آبادی نقل مکانی کر گئی ہو۔ جھنڈ میں داخل ہونے سے کچھ پہلے، سب سے عمر رسیدہ مورنی اُچھل کر سامنے آ گئی۔ اسے دیکھ کر مورنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن عمر رسیدہ مورنی نے کوئی دھیان نہ دیا بلکہ رُکھائی سے اسے اطلاع دی کہ اب جھنڈ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مورنی کو یوں لگا جیسے سناٹا اور گہرا ہو گیا ہو اور اس کی ذات میں اُتر آیا ہو۔ ''لیکن کیوں؟'' بہت کوشش سے اس نے مہین سی آواز نکالی۔

''اب بلا تاج اور بغیر پر، تم ایک پر نچی پرندہ ہو، مورنی نہیں۔ یہاں رہو گی تو دیگر مورنیوں کے پر بھی جھڑ جائیں گے۔'' رُکھائی سے جواب ملا۔

یہ زخم اس زخم سے زیادہ گہرا تھا جو وہ صبح کھا چکی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے ایک ہی دن میں اس کے ساتھ دوسری بار زیادتی ہوئی ہے اور اس دفعہ اپنوں کے ہاتھوں!

مورنی نے اپنا جسم چراتے ہوئے کہ کسی پوتر سے مس نہ ہو جائے مڑی اور تھکے قدموں اسی کنویں کا رخ کیا جس میں صبح اس نے اپنا عکس دیکھ کر ''پروں کو میں اپنے سمیٹوں یا باندھوں؟'' کا گیت الاپا تھا۔

# کالی آندھی

’’کون بتائے گا کہ خوشحال خاں خٹک کہاں پیدا ہوئے تھے؟‘‘ خانم نے بلیک بورڈ پر نہایت خوش خطی سے بڑی واضح لکھائی میں ’’خوشحال خاں خٹک‘‘ لکھا اور مڑ کر اپنی شاگردوں سے سوال کیا۔ پوری جماعت پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ سامنے کی قطار میں بیٹھی لڑکیاں ایسے چھپنے لگیں گویا ڈیسک ان کی لاعلمی پر پردہ ڈال دے گی۔ پچھلی قطاروں میں بیٹھی لڑکیاں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں کہ کہیں سوال پوچھنے والی سے آنکھ ملی تو یہ عمومی سوال خاص ان کی ذات پر آ جائے گا۔

’’بھئی میں نے ایسی کون سی مشکل بات پوچھ لی؟‘‘ خانم نے مسکرا کر سر پر دوپٹا درست کیا۔

’’جو بتائے گا، اگلے امتحان میں اس کے پانچ نمبر اضافی۔‘‘

’’مس وہ خٹک میں پیدا ہوئے تھے۔‘‘ سامنے بیٹھی یاسمین کے لہجے میں وہ بے یقینی نمایاں تھی جو غلط اندازہ لگانے والوں کا خاصہ ہے۔

’’نہیں یاسمین، خٹک تو ان کا قبیلہ تھا۔‘‘ خانم نے تصحیح کی۔ جواب طلب نظروں سے خانم نے شاہین کی طرف نظریں اُچکائیں، جیسے شاہین کو دعوتِ مبارزت دے رہی ہوں۔ شاہین جماعت کی سب سے ذہین لیکن لاأبالی طالبہ تھی۔ سوال براہِ راست اس سے پوچھ لیا تو جواب دے دیا، ورنہ ایسی لاتعلق جیسے سوال اس کے علاوہ ہر شاگرد سے پوچھا گیا ہے۔ چیونگ گم مستقل منہ میں گھومتی رہتی۔ خانم اس کی ذہانت اور علم کی وجہ سے اس کی بہت سی ایسی حرکتیں نظر انداز کر دیتیں تو دوسری شاگردوں کے لیے عتاب کا عنوان ہوتیں۔





’’مس وہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے میں واقع گاؤں ’’اکورہ‘‘ میں پیدا ہوئے تھے۔‘‘ شاہین کہاں چیلنج سے پیچھے ہٹتی تھی۔

’’شاباش!‘‘ ابھی خانم اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ ایک زوردار چھناکے کی آواز سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ کانچ کے ٹکڑے ڈیسک پر بکھر گئے تھے۔ آسانی سے نہ ٹوٹ سکنے والی چیزیں جب ٹوٹتی ہیں تو بہت بکھر جاتی ہیں۔ یہ شیشہ بھی شاید ایسے ہی خمیر سے بنا تھا۔ اس ڈیسک پر بیٹھی لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں کانچ گھس گیا تھا اور اس سے خون جاری تھا۔ ابھی خانم کوئی ردِ عمل ظاہر بھی نہ کر پائی تھی کہ دھم دھم دھم، کھڑکی، دیوار اور دروازے پر مزید پتھروں کی بھرمار ہو گئی۔ سب لڑکیاں سہم کر ڈیسک کے نیچے گھس گئیں۔ چند لمحوں پہلے جہاں علم و آگہی کا ماحول تھا، وہاں اب خوف و ہراس کا راج تھا۔

’’بند کرو یہ برائی کے اڈے۔‘‘ ’’اوئے خانہ خراب، عورت کا مقام اس کا گھر ہے۔‘‘

’’ماردیں گے سب کو۔‘‘

باہر سے آنے والے نعروں کی آوازیں ماحول کی وحشت میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ خانم کو ان نعروں کی زبان بہت اجنبی لگی۔ الفاظ تو شناسا تھے لیکن اس کا ذہن ان کے معنی قبول کرنے سے انکاری تھا۔ دور کہیں سے سائرن کی آواز آئی تو سب آوازیں بند ہو گئیں اور ایک بھگدڑ کا سا تاثر ملا جیسے بہت سے لوگ بھاگ رہے ہوں۔ چند لمحوں کے لیے سب آوازیں بند ہو گئیں۔ لڑکیوں کی خوفزدہ گھگھیاتی آوازیں، باہر سے آنے والے مشتعل نعرے، ان سب کی جگہ صرف چند لمحوں کے لیے ایک ایسے سناٹے نے لے لی جو عموماً کسی مرگ کی علامت ہوتی ہے۔ یہ سناٹا اچانک ایسے ٹوٹا کہ سب لڑکیاں ایک ساتھ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگیں۔ سب کے چہروں پر ہراس تھا۔ کم از کم پانچ لڑکیوں کے پتھر لگے تھے، دو کے لباس پر خون دیکھا جا سکتا تھا، تقریباً سب ہی کے آنسو جاری تھے۔

اتنے میں بھاگتے قدموں سے دوسری اُستانیاں اور ہیڈ مسٹریس کمرے میں داخل ہوئیں۔ مستطیل شکل کی اس عمارت میں خانم کی کلاس کا رخ باہر سڑک کی جانب تھا۔ شاید اسی لیے یہ کمرا نشانہ بنا تھا۔

’’کیا ہوا، کیا ہوا، کسی کو چوٹ تو نہیں آئی۔ کیسے جانور تھے، کس قدر نقصان کیا ہے۔‘‘ سب ایک ساتھ بول رہے تھے۔

اُستانیوں نے زخمی لڑکیوں کو لپٹایا۔نویں جماعت کی لڑکیاں سہمی فاختاؤں کی طرح آشنا چہروں اورمہربان بانہوں میں خودکومحفوظ پا رہی تھیں۔

’’کل سے ایک ہفتے کے لیے اسکول بند کر دیتے ہیں۔شہر کا ماحول آپ لوگوں کے علم میں ہے۔لیکن یہاں،لڑکیوں کے اسکول پر،کون سوچ سکتا تھا؟ اب سب ختم ہوگیا،جب ہم اپنے ہی تعلیمی اداروں پر سنگ باری کریں گے تو جستجو اور تحقیق کے زخموں پر مرہم کون رکھے گا۔‘‘ ہیڈ مسٹریس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

’’نہیں مس،لیکن مس۔‘‘ کئی لڑکیوں نے احتجاج کیا۔خوف صرف چہروں پر ہی نہیں آوازوں کی لرزش میں بھی نمایاں تھا لیکن کہیں خودشناسی اورلڑکپن کا باغیانہ جمال اس خوف پر حاوی تھا۔

’’اگر اسکول بند کیا تو یہ وحشی اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔‘‘ خانم نے بھی احتجاج کیا۔

’’لیکن میں بچیوں کی جان کیسے خطرے میں ڈال سکتی ہوں؟‘‘ ہیڈ مسٹریس تذبذب کا شکار تھیں۔

’’ہاں مس کچھ دنوں کے لیے بند کر دیں۔‘‘ شاہین کی راہ عموماً دوسروں سے جدا ہوتی تھی۔

’’ہمیں والدین کو اختیار دینا چاہیے کہ اگر وہ چاہیں تو بچیوں کو اسکول بھیجیں ورنہ ایک ہفتے کے لیے گھر پر تعلیم دیں۔‘‘ ایک ٹیچر نے صلاح دی۔

’’ارے مصلح الدین کہاں ہے؟‘‘

’’مصلح الدین اسکول کا ادھیڑ عمر چوکیدار تھا۔کسی کتابی علم سے بالکل چٹ لیکن لڑکیوں کو پڑھتے دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھتا تھا۔

’’باجی،ام تو نئیں پڑھا لیکن یہ بچیاں امارے واسطے پڑھتی اے۔‘‘ مصلح الدین کی منطق خانم کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔سب باہر لپکے،اسکول کے صدر دروازے کے سامنے مصلح الدین بے ہوش پڑا تھا۔اس کی ٹوپی دور جا گری تھی اور خشخشی داڑھی پر خون جما ہوا تھا۔خانم کے دل میں بدترین اندیشے جاگ اُٹھے۔لپک کر مصلح الدین کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔سانس چل رہی تھی۔کوئی بھاگ کر پانی لے آیا۔آہستہ آہستہ مصلح الدین کو ہوش آ گیا۔

’’ام نئیں چھوڑے گا ان خنزیر کے بچوں کو۔‘‘ اس حال میں بھی وہ ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں





تھا۔مصلح الدین کی حالت نے گویا لڑکیوں اور اُستانیوں میں عزم و حوصلے کی نئی روح پھونک دی۔فیصلہ آسان ہوگیا۔خیر و شر کی آویزش اتنی آسانی سے ختم ہونے والی نہیں تھی۔علم وحکمت جہالت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ ہوئی۔طے ہوگیا کہ کل سے اسکول پھر کھلے گا۔

خانم کا گھر اسکول سے ایک فرلانگ پر تھا۔بیوہ ماں کے ساتھ دو کمروں کے کوارٹر میں سکون سے گزارہ ہو رہا تھا۔اس کا باپ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہید ہوا تو حکومت کی طرف سے یہ کوارٹر مل گیا۔ماں باپ کی تربیت نے خانم کو صوم و صلوٰۃ کا پابند بنا دیا تھا۔لیکن اس کی شخصیت تضادات کا عجیب نقشہ تھی۔سر پر دوپٹے کے بغیر باہر نہیں نکلتی۔لباس سادہ لیکن اچھی تراش خراش کا،چہرے پر ہلکا سا میک اپ،اسے بھی خوبصورت لگنا اچھا لگتا تھا۔درس و تدریس جو شروع میں ضرورتاً اپنائی تھی،اب اس کے رگ و پے میں دوڑتی تھی۔اسے اپنے آس پاس کی جہالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا۔وہ جس ماحول کی پروردہ تھی،وہاں عورتیں ظلم کی چکّی میں پستی نظر آتیں۔گھر ہو یا بازار، اسکول ہو یا روزگار،اسے ہر جگہ عورت محض ایک مورت نظر آتی۔بے بسی اور مظلومیت کی تصویر۔من چاہے تو رنگ بھر کے سادہ تصویر کو خوش نما بنا دو۔تصویر میں مضمر گونگا پن ہی اس کی درازیِ عمر کی ضمانت ہے۔جہاں تصویر بولنے لگے،احتجاج کرنے لگے،برابری کے خواب دیکھنے لگے،وہاں اسے اپنی خواب گاہ سے نکال دو یا پھاڑ دو یا گھر کے کسی تاریک گوشے میں رکھ کر بھول جاؤ یا تختہ کر دو۔خانم کو اپنی سوچ اور حساسیت سے خوف آتا۔’’یہ ساری جہالت صرف تعلیم ہی سے دور ہوسکتی ہے۔‘‘ وہ اکثر اپنی معاون اُستانیوں سے کہتی۔

’’نماز ضرور پڑھو‘‘ وہ اپنی جماعت کی لڑکیوں کو ہدایت کرتی۔‘‘ ساتھ ہی فزکس،کیمسٹری، بائیلوجی،ادب اور آرٹس سے بھی آگہی رہے۔جتنا زیادہ دنیا کو سمجھو گی،اتنا ہی زیادہ اس کا بنانے والا سمجھ میں آئے گا۔‘‘ بعض اوقات تو اس کی منطق اس کی ساتھی اُستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن سر ہلا دینے میں وہ اپنی عافیت گردانتیں۔

خانم ابھی آدھے راستے پر پہنچی تھی کہ اچانک دو نوجوان کہیں سے نمودار ہو کر اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔

’’اسکول کل سے بند ہو جائے،ورنہ آج تو صرف ہلکا سے ٹریلر دکھایا ہے،کل پورا ڈراما دکھا دیں گے۔تمھیں پتا ہے نا....اسلام میں عورت کا مقام کہاں ہے؟‘‘ پہلے نے غرّا کے سوال کیا۔

’’گھر اور صرف گھر۔‘‘ اس سے پہلے کہ خانم کچھ کہہ پاتی دوسرے نے قطعیت سے جواب

UrduDost.com

دیا، ''اپنے مرد کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھنے والی کی ٹانگیں توڑ دینا چاہئیں۔'' دوسرے مرد نے ایسے خانم کو گھورا کہ خانم کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

''اچھی طرح سمجھ لے، ورنہ تیرے ساتھ وہ اسکول اور دوسری نافرمان عورتیں بھی یوں اُڑا دیں گے۔'' پہلے نوجوان نے چٹکی بجا کے اپنی دھمکی کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ خانم کو پھریری آ گئی، اپنے آپ میں اور سمٹ گئی۔

''تم مسلمان عورت ہو کر بے دینی کی راہ پر چل رہی ہو۔'' دونوں جتنے اچانک آئے تھے، اتنے ہی اچانک غائب ہو گئے۔

اب خوف خانم کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ دوسرے دن اسکول گئی تو ہر قدم پر مڑ کر اپنے پیچھے دیکھتی جاتی تھی۔ اس واقع کا اس نے اسکول میں کسی سے ذکر نہیں کیا کہ کہیں اسکول بند ہی نہ ہو جائے۔ آج اسکول کا ماحول برائے نام ہی تدریسی تھا۔ والدین اور اساتذہ کی مختلف ٹولیاں مذہب، حفاظت، امتحانات وغیرہ کی بحث میں اُلجھی رہیں۔ مصلح الدین سر پر پٹی باندھے اپنے اسٹول پر براجمان رہا۔ اسکول کے صدر دروازے کے آگے ایک پولیس وین تعینات ہو گئی۔

وقفے کے دوران اُستانیوں میں مستقل یہی موضوعِ گفتگو بن گیا۔

''یہ لوگ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہے، باہر نکلنے سے عورت کا تقدس مجروح ہوتا ہے، بچیوں کو گھر پر بھی تو پڑھایا جا سکتا ہے۔'' ایک ٹیچر نے صلاح دی۔

''رزم گاہِ حیات میں خیر و شر کی آویزش تو ہمیشہ سے چلتی رہی ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔'' خانم ٹیچر کم، فلسفی زیادہ تھی۔

''بھئی تمھاری منطق ہمیشہ اُلٹ ہوتی ہے۔ قرآن اُٹھا کے دیکھ لو صاف لکھا ہے کہ عورت کا مقام گھر میں ہے۔'' اس کی ساتھی ٹیچر بھی اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی۔

''آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ معاملہ تشریح کا ہے۔ کلامِ الٰہی سے لوگ اپنے اپنے مقصد کا مفہوم نکالتے ہیں۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ میں کسی کی آئیڈیالوجی کی کرسی پر بیٹھوں۔ جب میں اپنی نشست و برخاست سے مطمئن ہوں۔'' خانم نے سوال کیا۔

''تو کیا کریں، مر جائیں؟ تمھیں معلوم ہے، یہ لوگ کتنے ظالم ہیں۔'' ٹیچر نے سوال اُٹھایا۔

''نہیں، جب آندھی چلتی ہے تو چراغوں کو اس کے راستے میں نہیں رکھ دیتے بلکہ ان کی



UrduDost Library

حفاظت کا انتظام کرتے ہیں۔ آندھی تو وقتی ہے، گزر جائے گی۔ بس ایسا نہ ہو وقت کا یہ عفریت چراغوں کو بجھا کے گزرے۔'' اب دوسری تمام اُستانیاں بھی ان دونوں کا مکالمہ غور سے سن رہی تھیں۔

''لیکن بچیوں کو کچھ سال گھر پر پڑھا لیں۔ تم ہی تو کہہ رہی ہو، یہ آندھی عارضی ہے۔'' ایک اور ٹیچر نے لقمہ دیا۔

''ایسا کر سکتے ہیں لیکن واقعات کا تسلسل انسانوں اور قبیلوں کے ارتقا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں کے ارتقا پر۔ گھر پر بٹھا دینے سے ان کی کردار سازی پر منفی اثر پڑے گا۔ بنانے والے کی ذاتی پسند یا ناپسند کردار سازی میں جھلک اُٹھے تو اس سے تخلیق کی آزادی میں فرق پڑتا ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ تخلیق خود اپنا راستہ چن سکے۔'' خانم سے جیتنا مشکل تھا۔

خود کلاس میں بھی کئی دن تک سائنس، تاریخ، مذہب کا مضمون سمٹ کر کسی طرح اسی بحث پر مرکوز ہو جاتا۔

''مس یہ لوگ اپنا کام کریں اور ہمیں اپنا کرنے دیں۔'' شاہین نے بہت معصوم سے سوال میں گویا مسئلے کی بنیاد کا کلّی حل تجویز کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاہین، لیکن ہم لوگوں میں برداشت کا حسن ختم ہو گیا ہے۔ ہم لوگ ''مختلف'' کو ''برا'' کے معنوں میں لیتے ہیں۔ حالانکہ مختلف ہونے میں تو حسن ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ سب کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیتے۔''

کبھی کبھی یہاں بھی خانم کی منطق عجیب ہو جاتی۔

''دیکھو بچیو! یہ ڈر کی بات ضرور ہے، لیکن مایوسی کی نہیں۔ اس طرح کی مصیبتیں اور آفتیں قوموں کے لیے اچھی ہیں۔ ان کے مقابلے کے لیے قومیں نئے راستے نکالتی ہیں، اپنی بہترین اچھائیوں کے ساتھ ایک اکائی بن جاتی ہیں اور سرخرو ہو کر ایک بہتر قوم کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔'' خانم لڑکیوں کے کھلے ہوئے منہ اور حیرت زدہ چہروں سے بے خبر بولے جاتی۔

ایک ہفتہ بغیر کسی حادثے کے گزر گیا۔ آہستہ آہستہ اسکول کی فضا میں پھر وحشت کی جگہ جستجو اور عالمانہ وقار نے لے لی۔ فضا میں پھر طالبات کے قہقہے گونجنے لگے۔ یہ طالباتِ علم طالبانِ جہل کے منصوبوں سے بے خبر اپنی دنیا میں پھر سے مگن ہو گئیں۔ اسکول کے صدر دروازے سے پولیس وین بھی ہٹا لی گئی۔ منگل کی صبح گھر سے نکل کر ابھی خانم آدھے راستے بھی نہیں پہنچی تھی کہ دونوں

نوجوان اس کے دائیں بائیں پھر سے موجود تھے۔

"تم سے کہا تھا اسکول بند ہو جائے۔" لہجے میں تحکم اور بھیڑیے کی سی غرّاہٹ تھی۔

"اسکول میرا نہیں ہے اور ہوتا بھی تو بند نہیں کرتی۔" خانم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے پتا تھا، تم ایسے باز نہیں آؤ گی اور مزہ چکھانا ہی پڑے گا۔ یہ تیزاب چہرے کو ایسا گلزار کردے گا کہ جب بھی آئینہ دیکھو گی، اس میں بے غیرتی کا بدصورت چہرہ نظر آئے گا۔" سفاک لہجے میں دانت پیستے ہوئے دوسرے نوجوان نے اچانک جیب سے ایک محلول بھری بوتل نکال لی۔

"اوئے خانہ خراب کا بچہ ام تیرا قیمہ کردے گا۔" پیچھے سے اچانک مصلح الدین کی آواز گونجی اور بھاگتے قدم قریب آنے لگے۔ نوجوان نے پھرتی سے چاہا کہ بوتل کا محلول خانم کے چہرے پر پھینک دے مگر مصلح الدین نے ہاتھ مار کر سارا کھیل بگاڑ دیا۔ خانم کو لگا جیسے کسی نے اس کے شانے اور گردن میں جلتی ہوئی آگ سی بھر دی۔ منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ مصلح الدین نے اسے لپک کر پاس سے گزرتے ہوئے رکشے میں ڈالا اور واپس خانم کے گھر پہنچ گیا۔

ماں اور مصلح الدین کے کہنے کے باوجود خانم ڈاکٹر کے پاس جانے پر راضی نہیں ہوئی۔

"تم فوراً کیسے پہنچ گئے مصلح الدین۔" خانم نے استفسار کیا۔

"خانم! ام ان جہنمی لوگوں کو جانتا اے، ام کو مالوم تھا، یہ آپ کو نقصان پہنچائے گا۔ اس روز ام آپ سے بولا، روز آپ کے ساتھ چلے، پر آپ نئیں مانا۔ بس اس روز سے خامشی سے ام آپ کے پیچھے چلتا اے۔"

"آج تم نہ ہوتے تو نا معلوم میرا کیا حشر ہوتا۔" خانم کی آنکھوں میں شاید ممنونیت کے آنسو تھے۔ اس کے چہرے پر خوف و وحشت نے عجیب تاثر چھوڑا تھا لیکن دل میں ایک عزم موجیں مار رہا تھا۔

"مصلح الدین مجھے ایک ہیلمٹ لا دو۔"

"ہیملٹ، باجی ہیلمٹ کا آپ کیا کرے گا، سیکل چلائے گا؟" مصلح الدین اُلجھ گیا۔

"آپ گھر بیٹھو، اب اسکول مت جانا۔"

"مصلح الدین یہ لوگ چاہتے ہیں اسکول بند ہو جائے، ہماری بیٹیاں، بیویاں، مائیں سب جاہل رہ جائیں۔ اگر ہم ڈر گئے اور اسکول نہ گئے تو ان کا مقصد پورا ہوگا۔ اگر تمھاری بیٹی ہوتی اسکول میں تو تم کیا کرتے؟" مصلح الدین سے خانم سادہ اور سلیس گفتگو کرتی۔





"ام... ام اس کو ضرور اسکول بھیجتا۔ ام اس کے ساتھ جاتا۔ ام پٹھان ہے، ام جنگ سے ڈرتا نئیں... یہ امارا جنگ اے۔" مصلح الدین اچانک جوش میں آ گیا۔

"شاباش، یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔" اس حال میں بھی خانم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"بات تو آپ کا ٹھیک اے لیکن..." مصلح الدین سمجھ گیا کہ خانم نے اس سے چالاکی سے اپنی بات کہلوالی ہے۔

"ٹھیک اے، پر امارا شرط اے، اب ام روز آپ کے ساتھ چلے گا۔"

خانم اس دن اسکول نہیں گئی۔ شام تک ہیلمٹ بھی آ گیا۔ تیزاب کے صرف چند قطرے ہی گردن اور شانے پر پڑے تھے، جہاں جہاں قطرے پڑے تھے، وہاں چھالے سے پڑ گئے تھے۔ اماں نے چھالوں پر مرہم رکھا۔ خانم کا سر گود میں رکھ کے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

"بوتل میرے چہرے پر خالی ہو جاتی تو؟" خانم کو جھرجھری آ گئی۔ اس دن وضو کرتے ہوئے خانم بہت دیر تک اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات اس کے ذہن میں آتے رہے۔

"یا اللہ میری حفاظت کر۔" خانم نے گڑگڑا کر دعا مانگی۔

اسکول میں پہلے تو سب خانم کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ جب تفصیل معلوم ہوئی تو ہنگامہ ہو گیا۔ بہت سے ہاتھ خود بخود اپنے چہروں پر پہنچ گئے۔ زیادہ تر طالبات اور اساتذہ پُرزور طریقے سے اسکول بند کرنے کی حمایت میں تھے۔ شاہین پر بھی جیسے ہسٹیریا طاری تھا۔

"نہیں پڑھنا مجھے، جھلسے ہوئے چہرے سے بہت خوف آتا ہے۔"

خانم کو تیزاب سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی شاہین کے ان جملوں سے۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ دیکھ کر شاہین لمحے بھر کو چپ سی ہو گئی۔

"آپ لوگوں کو پتا ہے خوشحال خاں خٹک کی قبر کے کتبے پر کیا کندہ ہے؟"

دا افغان پہ نانگ می ، و ترلا تورا
نہ نہ گیا لہ دا زمانہ خوشحال خٹک یام

"یعنی میں نے افغان وقار کی حفاظت کے لیے تلوار اُٹھائی ہے۔ میں ہوں خوشحال خٹک، اس دور کا عزت دار انسان۔"

"آج پھر ہماری عزت اور وقار خطرے میں ہے۔ ہم سب اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں جس میں خوشحال خان سانس لیتا تھا۔ اگر آپ لوگ اسکول نہیں بھی آئیں گے تو میں اکیلی آؤں گی۔ جولڑکی پڑھنا چاہے گی اسے پڑھاؤں گی، اسکول بند نہیں ہوگا۔"

آج خانم کی تقریریں اور دلیلیں بھی کام نہیں آ رہی تھیں۔ بیشتر اساتذہ اور طالبات نے اعلان کر دیا، وہ کل سے اسکول نہیں آئیں گے۔ چند ہی سر پھرے اساتذہ اور طالبات اسکول کھلا رکھنے پر آمادہ تھے۔ آخر طے یہ ہوا کہ اسکول کھلا رہے گا لیکن ایک سال کے لیے، جو آنا چاہے، وہ آئے، جو نہ آنا چاہے، اس کی ملازمت ختم نہیں ہوگی۔ حالات کے بدلنے کا انتظار کیا جائے۔ شاہین نے اعلان کیا کہ وہ کل سے نہیں آئے گی، گھر پر ہی پڑھے گی۔ خانم کا خیال تھا کہ مزاحمت کے بغیر یہ آندھی اور زور پکڑ لے گی۔

اب مصلح الدین روز خانم کو گھر سے لینے اور چھوڑنے جانے لگا۔

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ تیسرے دن اسکول کے راستے میں خانم پھر گھیر لی گئی۔ اس دفعہ دو نئے چہرے سامنے تھے۔ چہرے پر سفاکی کی وہی بہیمانہ نقاب جو تیزاب پھینکنے والے نوجوانوں کے چہروں پر بھی آویزاں تھی۔

"ہم نے تو بہت کوشش کی کہ سیدھی انگلی سے گھی نکل آئے مگر جو عورت برائی کے راستے پر چل پڑے... چچ چچ چچ..." کہتے ہوئے مصنوعی افسوس کے ساتھ داہنے ہاتھ والے نوجوانوں کے ہاتھ میں ٹی ٹی نکل آئی۔

"اوئے خنزیر، نجانے کہاں سے اچانک مصلح الدین کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آئی۔

نوجوان نے بغیر کسی تساہل کے گولی چلا دی جو مصلح الدین کے داہنی جانب سینے میں پیوست ہوگئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ ٹی ٹی کا رخ خانم کی جانب موڑ کر نوجوان نے اسے خانم کے جسم پر خالی کر دی۔ خانم تو شاید پہلی گولی کے بعد ہی زمیں بوس ہوگئی تھی، منہ اور ناک سے خون جاری تھا، ایک گولی گردن میں لگی تھی، وہاں سے خون کا ایک فوارہ نکل رہا تھا۔ نوجوان نے خانم کی لاش پر ایک لات ماری، آخ تھو سے اپنی انتہا پسندی کا مزید اظہار کیا اور سر کے اشارے سے اپنے ساتھی کو بھاگنے کا اشارہ دیا۔

اسکول میں لوگ ہی کتنے تھے، خبر ملتے ہی صفِ ماتم بچھ گئی۔ خانم ہر دل عزیز اُستانی تھی۔ پھر اس کی جدوجہد، مستقل مزاجی اور تحمل نے اس کی عزت اور وقار میں بے حد اضافہ کر دیا تھا۔ مصلح





الدین کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں آپریشن کے ذریعے سینے سے گولی نکالی گئی اور معجزانہ طور پر مصلح الدین موت کے منہ سے واپس آ گیا۔

اسکول، انتظامیہ نے بند کر دیا۔ باہر ایک بڑے بینر پر جلی حروف میں اسکول کے بند ہونے کا اعلان چسپاں کر دیا گیا۔ مصلح الدین کوئی ایک ہفتہ اسپتال میں داخل رہا۔ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو واپس اسکول میں دالان کے نکڑ پر اپنی کوٹھری کا رخ کیا۔ مرے مرے قدم اُٹھنے سے انکاری تھے۔ دل بہت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ برآمدوں کا سناٹا فضا کو بر مار رہا تھا۔ دالان عبور کیا ہی تھا کہ کچھ آوازوں سے چونک گیا۔ یہ اسی کمرے سے آ رہی تھیں جہاں خانم اپنی جماعت لیا کرتی تھی۔ سردی کی ایک لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ دروازے کے دونوں پٹ بند تھے۔ دھکا دے کر کھولا تو دیکھا، شاہین تین لڑکیوں کو چپکے چپکے سبق دے رہی ہے۔ چاروں نے چادریں اوڑھی ہوئی تھیں کہ کتابیں، کاپیاں اس کے نیچے چھپ جائیں۔ بلیک بورڈ کے سیاہ ماتھے پر خوشحال خاں خٹک کی قبر کے کتبے پر کندہ الفاظ مشعلِ راہ کی طرح جگمگا رہے تھے۔

دا افغان پہ ناگ می و ترلا تورا
نہ نہ گیا لہ دا زمانہ خوشحال خٹک یام

☆☆☆☆☆

# زود پشیمان

میں نے دفتر کا دروازہ بند کیا، سفید کوٹ کی شکنیں درست کیں اور اسٹھینکو پ ہاتھ میں لے کر اسپتال کے لمبے برآمدے میں چل پڑا۔ کچھ عمارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے چھوٹے فاصلے اور دالان بھی لمبے اور طویل راہداریاں معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ اسپتال بھی ایک ایسی ہی عمارت لگی۔ یہ برآمدہ میری روزانہ کی گزرگاہ ہے۔ صبح سات بجے اسپتال پہنچ کر پہلے اپنے داخل شدہ مریض دیکھتا ہوں پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ان سے فارغ ہو کر اپنے مطب پہنچ جاتا ہوں۔ کبھی کبھی اسپتال میں زیادہ مریض داخل ہو جائیں یا کوئی مریض زیادہ بیمار ہو تو مطب جانے میں دیر ہو جاتی ہے اور بہت کوفت ہوتی ہے۔ اسپتال کے برآمدے کا اپنا ایک ماحول ہے۔ صاف شفاف عموماً بڑے ٹائلز سے بنا فرش، کونوں میں گملے رکھے ہوتے ہیں۔ اگر راہداری میں کمرے بھی نکلے ہوئے ہوں تو ان کے دروازے کا ایک پٹ بند ہوگا۔ دروازے پر نام کی تختی ایستادہ، جس پر مختصر نام کے ساتھ اکثر ڈاکٹر کی تعلیمی یا غیر تعلیمی قابلیت کا ایک طویل دُم چھلہ تحریر ہے۔ جن برآمدوں میں کوئی کمرے نہ نکلتے ہوں، وہ ایسے لگتے ہیں جیسے ابھی اینٹی بیوٹک سے دھو کر ایستادہ کر دیئے گئے ہوں۔ استپال کے کمروں کے مقابلے میں برآمدے کا موسم نسبتاً صحت مند محسوس ہوتا، زیادہ تر مسافر، وہاں یہ سب عارضی مسافر ہی تو ہیں، ہٹّے کٹّے چابکدستی سے اِدھر اُدھر جا رہے ہیں، اکثر کسی نحیف، کمزور اور بیمار کے سہارے کا باعث ہیں۔ ان برآمدوں کی ٹریفک میں آپ کو حفظِ مراتب کا بہت لحاظ ملے گا۔ سامنے سے کوئی طبیب آ رہا ہو تو لوگ دیواروں کے ساتھ ساتھ





چلنے لگتے ہیں۔ جیسے طبیب نہ ہوا جھومتا جھامتا کوئی بادشاہ کا ہاتھی ہو اور اگر کوئی بہت طبیبِ خاص آ رہا ہو تو اسپتال کے نچلے درجے کے ملازمین نہ صرف دیواروں کے ساتھ چلنے لگتے ہیں بلکہ دیوار کا حصہ بن جانا چاہتے ہیں۔ نظر پڑ گئی تو کوئی کام نہ کہہ دے۔ طبیبوں کی عمومی کیفیت یہ ہے کہ جتنے بدمزاج ہوں گے اتنے ہی شاید اچھے سمجھے جائیں گے۔ اس لیے اس وصف میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے درپے ہیں۔

خیر میں تیز ڈگ بھرتا اپنے پہلے مریض کے کمرے میں داخل ہوا۔ ''ہاں بھئی! سجاد کیا حال ہے؟'' سجاد کی بیوی مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور دوپٹہ سر پر درست کیا۔ شاید مجھے کہنا چاہیے تھا کہ بیٹھ جاؤ مگر اتنا وقت کہاں ہوتا ہے، اکثر کمروں میں چار چار مریض ہوتے ہیں۔ کچھ ہال نما کمرے تو آٹھ دس مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بس درمیان میں ایک غربت کا پردہ ایسے لٹکا دیا جاتا ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اس انتظام کا ایک غیر ارادی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کمرے میں موجود آٹھوں مریض اور ان کے سینکڑوں لواحقین اور تیماردار سب ایک دوسرے کے احوال سے خوب واقف ہو جاتے ہیں۔ سجاد کے مالی حالات نے اسے ایک مریض والے کمرے کا حقدار بنا دیا تھا۔ ایسے مریض کو نہ صرف زیادہ تنہائی مل جاتی ہے بلکہ غیر ضروری اجنبی آنکھوں اور کانوں کے سوالیہ استفسارانہ حملوں سے بھی بچت ہو جاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک کمرے والے مریضوں کو نرس نسبتاً زیادہ توجہ دیتی ہے۔ ظاہر ہے آٹھ مریضوں کے کمرے میں اس کی توجہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ خیر میں آپ کو سجاد کا حال بتا رہا تھا۔

''جی سر آپ کے ہاتھ میں واقعی شفا ہے۔'' سجاد نے سلام کرنے کے بعد جواب دیا۔

''بھئی تم جب آئے تھے تو بالکل قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ میں تو ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کیا ہوگا۔ نہیں میں پریشان نہیں ہوا تھا لیکن یہ بہت دنوں کے بعد تشخیص کے متعلق سوچنا ضرور پڑ گیا تھا۔ اب دیکھو تمھارے گھر جانے کا وقت آ گیا ہے''۔ میں اپنے لہجے سے فخریہ انداز نہ نکال سکا۔

''جی سر اللہ نے بڑا کرم کیا۔ اس نے آپ کو کیسا وسیلہ بنایا ہے۔'' میرے زیادہ تر مریض مجھے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ کچھ سر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ میرے لیے دونوں قابلِ قبول ہیں۔ عموماً جو لوگ نام لے کر بلاتے ہیں وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس سے بلاوجہ ایک بے تکلفی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ جو میرے خیال سے ایک ڈاکٹر اور مریض کے درمیان مناسب نہیں۔

''یار سارا کریڈٹ تم نے اللہ کو دے دیا۔ اگر ایسا ہی تھا تو گھر بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے پھر دیکھتے کہ ٹھیک ہوتے ہو یا نہیں۔ میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''ارے نہیں ڈاکٹر صاحب وسیلہ تو آپ بنے ہیں۔ صحت دینا اور جلانا تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ مگر وسیلہ تو آپ ہیں۔'' سجاد کا پشیمانہ لہجہ بھی میری تلخی کم نہ کر سکا۔

''ہاں بھئی ہم محنت کر کے تھک گئے۔ تم نے کتنے اطمینان سے اس پر پانی پھیر دیا۔''

''ارے نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہی میری جان بچائی ہے۔ کہیں اگر اللہ نہ چاہتا تو آپ بھی نہیں بچا سکتے تھے۔ میں تو صرف آپ کو یہ یاد دلا رہا ہوں کہ مارنا اور بچانا دونوں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ بھی مسلمان ہیں ناں سر۔'' سجاد مفاہمت پر آمادہ لیکن عقیدے کا پکا تھا۔ مجھے کن اکھیوں سے ایسا لگا جیسے سجاد کی بیوی توبہ توبہ کر کے دونوں کلّے پیٹ رہی ہے۔

''ہاں! تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تم دوبارہ اگر اسی حال میں پھر آؤ گے تو بھی میں تمہیں بچا لوں گا... مرنے نہیں دوں گا۔'' میرا اعتماد اور اعتقاد اپنی جگہ تھے۔

''اللہ نہ کرے ڈاکٹر صاحب جوان کو دوبارہ ایسا مرض لگے۔'' سجاد کی بیوی نے لرز کے لقمہ دیا۔

''اچھا بھئی نرس تمہیں اسپتال سے برخواستگی کے کاغذات دے دے گی۔ ایک ہفتے بعد میرے مطب میں آ جانا۔'' میں سجاد کا بڑھایا ہوا ہاتھ نظر انداز کر کے مڑ گیا۔ ابھی بیماری سے اُٹھا ہے کم بخت اور ہاتھ بڑھائے دے رہا ہے... سر لو ملا لو۔ اگر ڈاکٹر بھی بیمار ہو گئے تو مریضوں کا علاج کون کرے گا۔

''شاید اللہ میاں'' میں دل میں مسکرا پڑا۔ کیسے جاہل مریض ہوتے ہیں واقعی۔

''ہائے کرن'' میں سجاد کے کمرے سے نکلا تو اپنی پسندیدہ نرس سے سامنا ہو گیا۔ سجاد سے بات کر کے طبیعت ذرا مکدر سی ہو گئی تھی وہ پھر بحال ہو گئی ہے۔

''کیسے ہو ڈاکٹر صاحب! آپ تو عید کا چاند ہو گئے ہو۔ کبھی ہمارے وارڈ بھی آ جایا کرو۔'' کرن نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔ میں نے بہت گرم جوشی کے ساتھ اس کا ہاتھ دبایا۔ دونوں ہی شعبۂ صحت میں کام کرتے تھے، ایک باہمی تعلق خود بخود بن جاتا ہے۔

آپ کرن سے ہاتھ ملایئے... لگتا ہے کوئی چھوٹی مچھلی ہاتھ میں پکڑ لی ہے۔ ہلکی سی سیلی ہوئی۔ ہاتھ آپ کی گرفت میں ایسا تڑپے گا کہ ایک پھریری سارے جسم میں دوڑ جائے۔ ہاتھ





چھوڑنے کا دل نہیں چاہا مگر اسپتال کا برآمدہ اس معانقے کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اب تقریباً آٹھ بج رہے تھے اور مجھے ابھی کم از کم تین مریض اور دیکھنے تھے۔ آج یقیناً مطب کو دیر ہو جائے گی۔ مگر آپ کرن سے بات کریں تو مریض اور مطب اس حلقۂ خیال میں نہیں آتے۔ مزے کی بات یہ کہ آپ کسی بھی نرس سے جتنی دیر چاہے باتیں کر لیں، شرط یہ ہے کہ کوئی دوسری نرس یا ڈاکٹر متوجہ نہ ہو۔ اگر کوئی دوسری نرس یا ڈاکٹر دیکھ لے تو یہ عمومی سماجی گفتگو مختصر کر کے چند منٹوں میں ختم کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ آپ بہت اعتماد سے شرط لگا سکتے ہیں کہ وہ نرس یا طبیب اتفاقاً دوبارہ آپ کے پاس ضرور چکر لگائے گا۔ بظاہر بہت مصروف اور کسی ضروری کام میں مشغول۔

کرن کو نبٹا کے میں مریض نمبر ۲ کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک ساٹھ سال کی خاتون تھیں۔ جو عارضۂ قلب کے لیے زیرِ علاج تھیں۔ ان کے پاس میں دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکا۔ حالانکہ اس کا شوہر بہت باتونی ہے اور اس دن بھی خوب سوال جواب کر کے باتیں کرنے کے موڈ میں تھا مگر مجھے اپنے مزاج کے برخلاف ذرا ترشی سے جواب دے کر جان چھڑانی پڑی۔ اگلا مریض ایڈز کے موزی مرض میں مبتلا تھا۔ چمڑی بلکل ہڈی سے لگ گئی تھی۔ میرے زیادہ تر مریض اچھے صاحبِ حیثیت ہوتے ہیں۔ یہ بلاوجہ گلے پڑ گیا تھا۔ عموماً غربت کا علاج اسپتال کے باہر ہی دوا دارو سے ہو جاتا ہے۔ یہ اسپتال، پرائیوٹ کمرا وغیرہ سب امارت کے چونچلے ہیں۔ میں نے دروازے سے ہی آواز دے کر اس کا حال دریافت کر لیا۔

''بھئی کل اندر کمرے میں جا کر دیکھ لوں گا۔'' میں نے اپنے ضمیر کو اطمینان دلایا۔ پانچوں مریضوں کو لشتم پشتم نبٹا کے گھڑی دیکھی تو نو بجے تھے۔ ادھر مطب بھی مریضوں سے بھرا ہوگا۔ اسپتال کے پانچ میں سے دو مریض مفتے کے تھے۔ ان سے ایک ٹکا بھی ملنے کا امکان نہیں تھا۔ نا جانے یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جب کہ مطب میں میری سیکریٹری صرف ان لوگوں کو وقت دیتی تھی جو بل کی ادائیگی کے قابل تھے۔ لہٰذا ان مریضوں کو انتظار میں مبتلا رکھنا اخلاقاً کوئی ایسی اچھی بات نہیں تھی۔ سائنس نے اتنی ترقی کی مگر ابھی تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہو سکا کہ صرف صاحبِ حیثیت لوگ بیمار پڑیں۔ غریبوں کا جب وقت پورا ہو جائے تو وہ بس اچانک مر جائیں۔ ابھی تو ٹھیک آپ کی گاڑی پر کپڑا مار رہے تھے۔ دوسرے لمحے لیٹ گئے اور دم نکل گیا۔

اب میں دوبارہ برآمدے میں قدم بڑھاتا تیز تیز باہر کی جانب جا رہا تھا۔ ایک دفعہ مرسڈیز میں بیٹھ جاؤں تو مطب صرف دس منٹ کی مسافت پر ہے۔ مجھے گاڑی کہنا اچھا نہیں لگتا بہتر ہے

کہ آدمی گاڑی کا نام لے تا کہ صورتِ حال زیادہ واضح ہو جائے ورنہ گاڑی سے تو موٹر سائیکل اور رکشہ وغیرہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ اس دن میرے ساتھ مرفی (Murphy) کے سارے قوانین جیسے چھیڑ چل رہے تھے۔ مرفی کا قانون تو آپ کو پتا ہی ہوگا۔ جو کچھ بھی غلط ہوسکتا ہے وہ سب ضرور ہوگا۔ سامنے سے شرافت اللہ کو آتے دیکھ کر میں نے اپنے قدم اور تیز کر لیے کہ جیسے میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس وقت بالکل شرافت اللہ کے ساتھ وقت ضائع کرنے کا موڈ نہیں تھا مگر شرافت اللہ مجھے دیکھ کر کھل اُٹھا۔

''ڈاکٹر صاحب'' اس نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب صرف ۲ منٹ اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میرا رضوان ٹھیک ہو جائے گا ناں؟''

اب اس سوال کا کوئی کیا جواب دے۔ رضوان اس کا تیرہ سالہ بیٹا تھا۔ ہڈی کا سرطان پھیل کے پھیپھڑوں میں بس گیا تھا۔ دوا تو کیا اب دعا کا بھی وقت گزر گیا تھا۔ بس چند ہفتوں کی بات تھی میں شرافت اللہ کو صاف الفاظ میں یہ سب بتا چکا تھا۔ ایک سائنس دان کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ سچ اور حقیقت کو جذبات اور امید سے علاحدہ کر دوں۔ اگر آپ مریضوں کو جھوٹی امیدیں اور دلاسے دینے لگیں تو یہ اسی دنیا میں جا بستے ہیں۔

''شرافت اللہ میں نے آپ کو اس دن بتا تو دیا تھا'' میں دیر ہونے کی وجہ سے جھنجھلایا ہوا تھا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب امید پر دنیا قائم ہے۔ کچھ تو حوصلہ دیں۔ دنیا میں معجزے بھی تو ہوتے ہیں۔ سر امریکہ میں روس میں کہیں بھی کوئی علاج ہو۔ میں اپنا مکان بیچ دوں گا۔ میں آپ کی پائی پائی چکا دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب معلوم تو کریں۔''

ضرورت آدمی کو کمزور اور محتاج بنا دیتی ہے۔ جھوٹی تسلی سے رضوان ٹھیک تو نہیں ہو جاتا۔

''شرافت اللہ میں تمہیں جاہل لگتا ہوں۔ کیا امریکہ کے ڈاکٹر ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ بھی وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو ہم پڑھتے ہیں۔ فرق صرف ذہنیت کا ہے۔ بس تم لوگوں کی غلامانہ ذہنیت کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔'' میں بھڑک اُٹھا۔

''معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔'' شرافت اللہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''اچھا بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' میں تیزی سے باہر کی طرف لپک گیا۔





ابھی میں نے مرفی کے قانون کا ذکر کیا تھا ناں، آج سب ان ہونی ہو کر رہنی تھیں۔

شرافت اللہ سے چھٹکارہ ملا ہی تھا کہ سامنے سے اسپتال کا مالک داخل ہوا۔

''ارے ڈاکٹر صاحب کیسے مزاج ہیں؟''

چراغ دین تھے تو نام کے ''موتی والا'' مگر اصل میں وہ ''ہیرے والا'' تھے۔ لوگوں کو میری آمدنی سے بہت دلچسپی رہتی ہے۔ آپ یقین کیجیے اسپتال میں جتنے ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ چراغ دین صاحب ان میں سے ڈاکٹر کی آمدنی کا تیس فیصد وصول کرتے ہیں۔ جی، ہر ڈاکٹر کی آمدنی کا تیس فیصد، لوگ مکھی چوس ہیں، خون آشام ہیں، چراغ دین ڈاکٹر چوس ہیں۔

''آپ سنایئے چراغ دین صاحب! کیسے مزاج ہیں۔ شاید سالانہ ڈنر کے بعد آج ملاقات ہو رہی ہے؟'' میں نے بڑھ کے گرم جوشی سے چراغ دین صاحب کے ہاتھ تھام لیے۔

''آیئے ڈاکٹر صاحب... ایک کپ گرم کافی کا ہو جائے'' چراغ دین میرا ہاتھ تھامے رہے۔

''وہ مطب، مریض......'' میں نے صفائی پیش کی۔

''ارے ڈاکٹر صاحب... مریض تو آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے، کافی تو کبھی کبھی ہوتی ہے۔'' چراغ دین کہاں چھوڑنے والے تھے۔

جب میں چراغ دین کے کمرے سے نکلا تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں نے کمرے سے نکل کر مرسڈیز کی جانب دوڑ لگائی۔ راستے میں سفید کوٹ سے اُلجھتا رہا۔ ایک ساتھ کوٹ بھی اُتر رہا ہے، جیب سے چابی بھی نکالنے کی کوشش ہے اور رفتار میں تیزی بھی۔

مرسڈیز میں بیٹھ کر اسے تیزی سے ریورس کیا اور ہارن بجاتا میں نے تیزی سے اسپتال کا موڑ کاٹا۔ اس تیزی میں وہ شلوار قمیض میں ملبوس نوجوان نظر نہ آیا جو اسپتال سے باہر جا رہا تھا۔ جب وہ نظر آیا اس وقت تک دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مرسڈیز کا بمپر اسے اُچھال کر دوبارہ زمین پر پٹخ چکا تھا۔ میں نے اپنی کرچوں کرچوں ونڈ اسکرین سے دیکھا تو صرف خون کے دھبے نظر آئے، اُتر کر تیزی سے نوجوان کی جانب لپکا۔ میرا حلق خشک تھا اور دل پسلیاں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔

''بس یہ اچانک سامنے آ گیا'' میں نے زور سے صفائی پیش کی حالانکہ لوگ ابھی سڑک کے اس پار تھے اور ہماری جانب لپک رہے تھے۔ میں نے نوجوان کو پلٹا تو سجاد کا خون بھرا چہرہ میرے

UrduDost.com

ہاتھ سرخ کر گیا۔ وہ تقریباً آخری سانسیں لے رہا تھا۔

’’ڈاکٹر صاحب یہ آپ ہیں۔‘‘ سجاد کی سانسیں اُکھڑ رہی تھی۔

’’میں نے کہا تھا ناں کہ مرنے والے کو آپ نہیں بچا سکیں گے۔‘‘ یہ میرا واہمہ ہی ہوگا... ورنہ مرتے ہوئے آدمی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ کیسے ہوسکتی ہے۔ سجاد کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مجھے اپنے چاروں طرف سفید کوٹ نظر آئے۔ کسی نے مجھے دھکّا دے کر ایک طرف کیا۔

’’جلدی کرو اسے اسٹیچر پر لٹاؤ‘‘ دور سے کسی کی آواز آئی۔

’’رہنے دو بہت دیر ہوگئی۔ ہم اسے نہیں بچا سکیں گے۔‘‘ مجھے تو اپنی آواز آ رہی تھی مگر دوسروں کو کیوں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا... میرا سنگِ مرمر کا خول چٹخ گیا ہے۔ میری ذات سمٹ کر ایک نکتہ بن گئی ہے، جسے سجاد کے خون نے سمو لیا ہے۔ میں نے اس کا جسم بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

☆☆☆☆☆



UrduDost Library

# سراب

پیارے احمر،

معاف کرنا چار مہینے سے خط لکھنے کا ارادہ کرتا تھا مگر انگلیاں فگار تھیں، قلم تھامنے سے معذور۔ دیکھا میرے دوست میری اُردو کی استطاعت میں ذرا کمی نہیں آئی۔ کیسا تم لوگ ڈراتے تھے کہ کالے انگریزوں والی زبان ہوجائے گی میری۔ ’’yes میں understand کرتا ہوں but۔‘‘ مگر یار سچی بات تو یہ ہے کہ جب طیارہ کراچی ایئرپورٹ سے اُڑا تو آنکھ میں بلاوجہ آنسو آ گئے۔ جسم تو یہاں آ گیا مگر دل وہیں رہ گیا۔ جہاز کی کھڑکی سے میں نے نگاہ ڈالی تھی تو ماچس کی ڈبیوں جتنے گھر ایک بے ترتیب قاعدے سے بکھرے پڑے تھے۔ جیسے کسی جن نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں ماچس کی ڈبیاں سمیٹ کر زمین پر پھینک دی ہوں۔ ان ہی میں سے کوئی میرا گھر بھی تھا... جواب میرا گھر نہیں تھا۔

خیر یار... یہ بھی کیا آفت ملک ہے۔ جتنی سارے کراچی میں سر بلند عمارتیں ہیں، اتنی تو ہاں ایک گلی میں ہیں۔ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ واقعی اتنی بلند ہے کہ سر اُٹھا کر دیکھو تو ٹوپی گر پڑے۔ سمجھو اسی لیے میں نے یہاں آ کر ٹوپی اُتار دی تھی۔ ویسے اور بھی بہت کچھ اثاثہ اُتار دیا ہے یا کھو دیا ہے مگر اس کا ذکر پھر کبھی کروں گا۔ افسوس جو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بلند ترین عمارتیں تھیں، وہ ’’کلچرل وار‘‘ کی نظر ہوگئیں۔ ہر چند اس میں کتنے ہی اپنے پیاروں کا خون ہوا مگر سنا ہے نئی لغت میں اس کو "collateral damage" کہتے ہیں۔ بھئی سچی بات ہے کہ میں نے تو اُترتے ہی خوب گوریاں تاڑیں۔ ایسا سرخ اور سفید رنگ کہ لگے آنکھوں میں سفید موتیا اُتر آیا ہے۔ ایک دن

سمندر کے کنارے بھی گیا تھا۔ بس سمجھو وضو ٹوٹ جائے آدمی کا۔ نیل گوں سمندر کا پس منظر اور سامنے جا بہ جا گلابی رنگ کی بارش تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو وہاں سے ہٹا سکا۔ یہاں میں نے ایک کمرا خرید لیا ہے۔ جو صرف میری دسترس میں ہے۔ میری اپنی دنیا، یہ ملک تو اس دنیا کا لگتا ہی نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے اللہ میاں بھی گورا ہے اور ہو سکتا ہے امریکی ہی ہو۔

احمر! یہاں ایک بہت بلند مجسمہ بیچ سمندر میں ایک جزیرے پر لا کر سجا دیا ہے۔ جسے مجسمۂ آزادی کہتے ہیں۔ جب امریکا کسی ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس مجسّمے پر ایک کپڑا اڈال دیتے ہیں تا کہ آتے جاتے بلا وجہ اس پر نظر نہ پڑے۔ شاید اس طرح ننگی جارحیت لباس پوش ہو جاتی ہے۔ شخصی آزادی بھی کمال کی ہے۔ یہاں واقعی سب انسان برابر ہیں۔ گورے دوسرے رنگوں سے کچھ زیادہ برابر ہیں۔ ویسے اگر کوئی گورا موجود نہ ہو تو رنگ دار نسلیں بھی برابر ہیں۔ ہمارے ملک کے مقابلے میں یہاں اخبار بھی بہت آزاد ہیں۔ کمال کی آزادیِ صحافت ہے۔ مثلاً آج کل عراق کی جنگ میں جو امریکی فوجی مارے جاتے ہیں، حکومت کے خیال میں ان کی تصاویر چھاپنے سے عوام میں بے چینی پھیلے گی۔ لہٰذا سب اخبارات نے آزادی سے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ایسی تصاویر نہیں چھاپیں گے۔ کمال کی آزادی ہے۔ بھئی میں تو بہت متاثر ہوا ہوں۔ حب الوطنی کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک جمہوری صدر کسی ملک پر غلطی سے حملہ کر کے لاکھوں آدمی مروا دے یا ایک قدیم تہذیب کا خون کر دے تو یہ نہیں کہ اس کے پیچھے ہی پڑ جائیں، بہت سمجھ دار لوگ ہیں، پردہ پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ہماری طرح سے جاہل نہیں کہ بیچ مجمعے میں کھڑے ہو کر پوچھ رہے ہیں کہ تم تو اتنے دراز قد ہو، یہ کُرتا کہاں سے آیا، تمھارے حصے کا کپڑا تو تھوڑا تھا۔ میں بہت خوش ہوں کہ میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ تم اور شکیل ابھی آنے میں جلدی مت کرنا۔ پہلے میں ذرا قدم جما لوں پھر تم لوگوں کو بلا لوں گا۔ اس دوران ہو سکے تو امریکی کلچرل سینٹر میں انگریزی کی کلاس لے لو، یہاں آسانی ہوگی۔ تمھارے دل و دماغ میں وہ جدیدیت آ جائے گی جو اُردو میڈیم لوگوں کی محرومی کا باعث ہے۔ مذاق کر رہا ہوں یار... مجھے پتا ہے تو 'اُردو میڈیم' سے کتنا چڑتا تھا۔ یار میں خوش تو بہت ہوں لیکن تنہائی ایک عذاب ہے۔ عجب نہیں کہ پنجرے میں پھڑ پھڑاتا ہر پنچھی دامِ صیاد توڑ کر بھاگ نکلنے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ ہو سکے تو خط کا جواب ضرور دینا بلکہ ابھی قلم اُٹھاؤ اور خط لکھنا شروع کر دو۔ گھر میں سب کو پیار۔ خالہ جان کو آداب کہنا۔ کہنا میرے لیے دعا کرتی رہا کریں۔ شکیل کو کل خط لکھوں گا۔

تمھارا دوست.....رضا





پیارے رضا!

تمھارا خط ملا۔ ہم سب نے مل کر پڑھا۔ میں شکیل، انصار اور امجد۔ مجھے تو لگا جیسے وہ سب حسد کر رہے تھے کہ تم نے مجھے خط کیوں لکھا۔ شاید تم مجھ سے سب سے قریب ہو، اور سب سے پہلے میرے ہی آنے کا انتظام کرو گے۔ یار کمال ہے تم اتنی جلدی سیٹ بھی ہو گئے اور کمرا بھی خرید لیا۔ کمال کے آدمی ہو۔ ہو سکے تو اپنی تصویر بھیجو، لوگ تو جاتے ہی ایک تصویر کار کے ساتھ اور ایک فون بوتھ کے ساتھ ضرور کھنچواتے ہیں۔ ہم سب لوگ بہت خوش ہیں کہ تم وہاں جم گئے ہو لیکن تمھارا خط کچھ اُلجھا دینے والا تھا۔ کبھی کبھی ذہن میں کچھ عجیب واہمے اور وسوسے بھی اُٹھتے ہیں۔ لیکن میں تو ہمیشہ منفی سوچ رکھتا ہوں۔

یہاں کے حالات وہی ہیں۔ مجھے خوشی ہے تم یہاں سے نکل گئے۔ ملک کے سیاسی حالات بھی وہی ہیں۔ چوروں کی سرکار ہے۔ ہماری قسمت دیکھو دودھ کی رکھوالی بلی کے حوالے کر دی ہے۔ ہر ملک اور قوم گزرتے ہوئے سالوں کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتی ہے، حالات پہلے سے بہتر ہوتے ہیں، پچھلے سفر اور مشکلات کے نشان مٹ جاتے ہیں اور نئے نشان تازہ منزلوں کا پتا دیتے ہیں۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ہمارے مسائل ہر سال گزرے ہوئے سالوں سے زیادہ گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں۔ غربت گھٹنے کے بجائے بڑھ رہی ہے۔ روشن خیالی کے سورج کو دقیانوسی سوچ کی تاریکی نے نگل لیا ہے۔ اچھا ہوا تم نکل لیے۔ کسی دن اپنا بھی بلاوا آئے گا امریکی ایمبیسی سے۔ اب تو یار سنا ہے صبح چار بجے سے قطار لگانی ہوتی ہے۔ پھر کہیں صبح نو بجے سفارت خانہ کھلتا ہے۔ تمھارا کام کتنی آسانی سے ہو گیا، لگتا ہے قسمت کی دیوی تم پر مہربان تھی۔ فی الحال میرے خیال میں تو میرا نکلنا مشکل ہے۔ تم دل لگا کر کام کرو اور اپنی ترقیوں سے ہم سب کو حیران کرتے رہو۔ بہت خوشی ہوتی ہے جب اپنے ملک کا کوئی آدمی خاص کر کوئی اپنا دوست وہاں کامیاب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب خرابی خام مال میں نہیں بلکہ تنور یا کمہار میں ہے۔ ہاں اپنی گوری گرل فرینڈ کی تصویریں بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اسے بالکل بھاوج کی نظر سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اپنی گرل فرینڈ سمجھیں گے۔ ہا... ہا... ہا۔ امی بھی تم کو بہت دعا لکھوا رہی ہیں۔

تمھارا.....احمر

UrduDost.com

UrduDost Library

پیارے احمر!

وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ پتا نہیں وقت نے اپنی طنابیں کھینچ رکھی ہیں اور ہم گزر رہے ہیں یا واقعی یہ وقت دوڑ رہا ہے۔ عجیب سراب ہے، یہ سب کچھ، اس وقت برف پڑ رہی ہے۔ میرے کمرے کی کھڑکی میں گرل لگی ہے۔ (حفاظت کے لیے) نہ جانے کس کو کس سے محفوظ رکھنا ہے۔ یہ کھڑکی کھل تو نہیں سکتی مگر اس میں سے روئی کے گالے آسمان سے ایسے اُتر رہے ہیں جیسے چھوٹے چھوٹے پیراشوٹ آسمان سے سردی درآمد کر رہے ہوں۔ جوڑوں تک میں یہ سردی بیٹھ گئی ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ امریکا کی جڑ میں بیٹھ گیا ہوں۔ یار میں کہیں پڑھ رہا تھا کہ اصلی امریکی وسطی ایشیا سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ اگر ایسا درست ہے تو کچھ حوالے اور کاغذات بھیجو تا کہ میں مالکانہ حقوق کی درخواست دائر کر سکوں۔ یہ گورے تو بعد کی پیداوار ہیں۔ آج کچھ طبیعت پر زیادہ قنوطیت طاری ہے۔ خیر، اب میرے بہت سے پولیس والے بھی دوست بن گئے ہیں۔ خوب جان بنا رہا ہوں، دیکھو گے تو پہچان نہیں پاؤ گے۔

لڑکیوں کا معاملہ خوب چل رہا ہے۔ یار میں نے تو اپنی تیئیس سال کی کسر نکال لی ہے۔ وہاں تو ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں رہ رہے تھے۔ یاد ہے ایک دن حسینہ کو مسکرا کے دیکھ لیا تھا تو اس کا بھائی لڑنے آ گیا تھا۔ پھر بھی یار تو کمال کا آدمی ہے، اس کے باوجود تو نے اس کا فون نمبر حاصل کر لیا تھا۔ یہاں یہ حال ہے کہ مسکرا کر نہ دیکھو تو بھائی لڑنے آ جاتا ہے۔

میں خوب گھوم رہا ہوں۔ یہ بہت بڑا ملک ہے۔ بہت امیر، لیکن یار میں نے فقیر یہاں بھی دیکھے ہیں۔ ضرورت اور غربت سرحدوں کی قیدی نہیں ہوتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر فقیر گٹار بجا کر بھیک مانگتے ہیں۔ ان کا ہالی ووڈ تو اتنا مست ہے لیکن موسیقار بھیک مانگتے ہیں۔ اچھا یار اب تھک گیا، پھر لکھوں گا۔ ابھی نئی گاڑی لینے جانا ہے۔

تمھارا دوست.....رضا

پیارے رضا!

نئی گاڑی، لڑکیاں، برف باری، یار تو امریکا میں ہے یا جنت میں۔ کچھ حیرت نہیں کہ امریکی سفارت خانے کے باہر لمبی لمبی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ خیر میاں... جہاں رہو مزے میں رہو۔ دیکھو کتنی جلدی اگست آ گیا ہے۔ ابھی تم پچھلے ماہِ جنوری میں ہی تو گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈیڑھ سال گزر گیا۔ معاف کرنا تقریباً چار مہینے کے بعد تمھیں جواب لکھ رہا ہوں۔ بس ایسے ہی طبیعت پر



سستی طاری تھی۔ یار آج چودہ اگست ہے۔ بڑی بڑی توپیں اور ٹینک عوام کو سلامی دیتے ہوئے گزریں گے۔ ہے ناں فخر کی بات۔ یار مجھے تو اپنی فوج پر بہت فخر ہے۔ کل ایک صاحب مذاق کرنے لگے، بولے اصل میں یہ ٹینک اور توپیں عوام سے سلامی لیتے ہوئے گزرتے ہیں۔ احمقوں کی بھی کمی نہیں۔ میرے خیال میں تو جب تک ہماری فوج کے پاس ٹینک، طیارے اور آب دوزیں ہیں، ملک محفوظ رہے گا۔ غربت اور امارت تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ تم نے لکھا نہیں تھا کہ فقیر امریکا میں بھی ہوتے ہیں؟

اس درمیان میرے حالات کچھ بہتر ہو گئے ہیں۔ کام خوب چل رہا ہے۔ اب میں نے تین دکانیں لے لی ہیں۔ بلکہ مجید اب میرے پاس منیجر کا کام کر رہا ہے۔ میرے خیال میں تو اپنے دوست کو منیجر رکھنا... ایسا ہی ہے جیسے آدمی اپنے سسر کے ساتھ بزنس پارٹنرشپ کر لے۔ تو سمجھ رہا ہے ناں... میرا مطلب۔ یا میری حسِ مزاح بھی امریکی ہو گئی ہے؟ بس یار تو وہاں عیش کرتا رہ۔ کبھی کبھار ہم غریبوں کو ایسے ہی خط لکھ کے یاد کر لیا کرو۔ اب میں نے وہاں آنے کا فیصلہ بالکل بدل دیا ہے۔ یہاں سب کچھ موجود ہے۔ جب تم آؤ گے تو خود ہی دیکھ لینا، کام کتنا پھیل گیا ہے۔ لہٰذا میرے اسپانسر شپ کے کاغذات مت بھیجنا۔ بس اپنا کام جماؤ۔ ہاں کون سی گاڑی خریدی تم نے۔ یار گرل فرینڈ کی تصویر بھیجنے کا شکریہ، بالکل ہالی ووڈ کی اداکارہ لگ رہی ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں، بہت ملتی ہے۔ مزے کر لے بھائی۔

تمھارا دوست.....احمر

پیارے احمر!

یار مجھے افسوس تو ہوا کہ تم نے امریکا آنے کا ارادہ بدل دیا ہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم وہاں اتنا زبردست کام کر رہے ہو۔ اگر وہاں کام اچھا چل رہا ہے تو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس خط کے ساتھ کچھ پیسے بھیج رہا ہوں۔ ہو سکے تو ایدھی ٹرسٹ بھجوا دینا۔ آج طبیعت بہت اُداس ہے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کس کا شعر ہے کہ:

آج کچھ بے سبب اُداس ہے جی
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی

پچھلے دنوں میں نے بہت وزن گرا لیا ہے۔ اب مڑ کے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کیا میرا یہاں آنے کا فیصلہ ٹھیک تھا؟ میرے بھائی ہر آدمی کو اپنی صلیب خود اُٹھانی ہوتی ہے۔ میں

UrduDost.com

بلاوجہ گمبھیر ہو جاتا ہوں۔ میں بہت خوش ہوں کہ تو یہاں نہیں آ رہا۔ میں بہت خوش ہوں۔ خوب پیسے بنا رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے امریکی سرکار کا مہمان ہوں، جسے وہ بٹھا کر کھلا رہی ہے۔ اپنا بہت بہت خیال رکھنا اور ہاں میری کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کرنا۔ خالہ جان کو بہت بہت آداب۔ میں ان سے بہت شرمندہ ہوں۔ کاش، اے کاش۔

تمھارا بہت دور بیٹھا دوست.....رضا

رضا

یہ کس قسم کا خط تھا میرے بھائی۔ مجھے بہت اُداس کر گیا۔ سب خیریت تو ہے۔ تو بہت تنہا اور اُداس لگا... مجھے اس خط سے۔ مجھے بہت فکر ہوگئی ہے تمھاری طرف سے۔ اب تم فوراً ٹکٹ کٹا کر کسی دن اچانک حیران کر دو اور اپنی من موہنی صورت دوبارہ دِکھا جاؤ۔ معاف کرنا میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں، اس لیے بہت مختصر خط لکھ رہا ہوں۔ امی بہت دعا کہہ رہی ہیں۔ پھر تفصیل سے آئندہ لکھوں گا۔

احمر

محترم جناب احمر صاحب!

مسٹر رضا احمد کا کل شام جیل میں انتقال ہوگیا۔ امریکا آنے کے تین ماہ بعد وہ کریڈٹ کارڈ فراڈ میں گرفتار ہوگئے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق آپ کو اطلاع دی جارہی ہے۔ رضا نے تقریباً ایک سال تک HIV کا بسترِ مرگ پر خوب مقابلہ کیا۔ Jesus اس پر رحم کرے۔

جان ڈوہ
سپرنٹنڈنٹ جیل

سپرنٹنڈنٹ جان کا خط شکیل کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے۔ یہ ایک سال میں اسے دوسرا دھچکا لگا تھا۔ احمر کے نام آنے والے تمام خطوط احمر کی والدہ شکیل کو دے دیتی تھیں۔ احمر کا انتقال تو تقریباً ایک سال پہلے ہی ٹریفک کے حادثے میں ہوگیا تھا۔ لیکن احمر کی خواہش تھی کہ رضا کو اس بات کا پتا نہ چلے تاکہ وہ امریکا میں اپنے قدم جما سکے۔ اب احمر کے نام سے خطوں کے جواب دے دے کر شکیل کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا۔ جھوٹی تسلیوں سے بنایہ جال، آج اپنے محرک کی موت سے ٹوٹ گیا تھا۔



UrduDost Library

# جگ بیتی

میں ایک سنگلاخ، چٹیل، عمر رسیدہ، کرّہ کب سے اس رنگ بدلتے آسمان میں اسیرِ سفر ہوں۔ خالق کی طرح میرے ننانوے نام تو نہیں لیکن درجنوں ضرور ہیں۔ ارض، دھرتی، ماتا، مادرِ گیتی، ارتھ اور گلوب وغیرہ۔ صدیوں سے رہٹ کے بیل کی مانند اپنے ہی سائے کے تعاقب میں سرگرداں ہوں۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہوگئی ہیں، داخلی بخار بڑھ گیا ہے۔ بیرونی منظر تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن میں ان صدیوں کی کہانیاں اپنے سینے میں دبائے گھومے جا رہی ہوں اور میاں عمر کی بھی خوب پوچھو ہو۔ عظیم فلسفی، مفکّر، زیرک، سائنس داں، سب کے اپنے اپنے خیالات، اپنی اپنی باتیں لیکن ابھی تک میرا سنِ ولادت ایک راز ہی ہے۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور میاں اس عمرِ دراز میں ان گناہ گار آنکھوں نے کیا کیا نہ دیکھا اور اس سوختہ جگر پر کیا کیا نہ گزری۔ اس پیری میں کیا کیا نہ صدمے اُٹھانے پڑے ہیں۔ ہر کہانی سنانے بیٹھ جاؤں تو تمھاری تو عمر بیت جائے گی اور میری ایک داستان بھی مکمل نہ ہوگی۔ میر صاحب حیات ہوتے تو کہتے:

زمیں کر مختصر فسانے کو
اپنی تو زندگی گزرنے لگی

کہو تو وزیر صاحب کے بارے میں بتاؤں۔ آج کل کس قدر ڈھسے کے آدمی ہیں۔ وہ نخرے

ہیں کہ فرشِ مخمل پر مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں۔ سنا ہے خاص پیرس سے منگوا کے خوشبو لگاتے ہیں۔ یاد کرو تو ہنسی آتی ہے۔ ان کے آباء منگولوں کے ہاں مزدور تھے اور ایک کے پیچھے ایک ننگے پیر بھاگے پھرتے تھے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو۔ تمھارے لیے تو واقعی قصۂ پارینہ ہے لیکن میرا تو آنکھوں دیکھا حال ہے۔ آٹھ صدیوں میں اس پیڑی پر کیا کیا گزری ہے، ایک دل چسپ کہانی ہے۔ یا یہ جو تمھارے پڑوس میں پیر صاحب آتے ہیں...وعظ کے لیے۔ ان کا تعلق پٹیالہ کے ایک مشہور گھرانے سے ہے۔ ارے میاں جہانگیر کے دور میں ان ہی پیر صاحب کی پرنانی کی خالہ کی پرنانی کے ہاں لوگ زنوائے ادب تہ کیے شاعری و موسیقی سیکھنے آیا کرتے تھے۔ ہاں میاں، گردشِ حالات کے ہاتھوں چند صدیوں میں شجروں کی شناخت بدل جاتی ہے۔ وقت کے گزرنے سے موسموں کے مزاج تو نہیں بدلتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ حالات گزرتے وقت کے ساتھ نیا لباس پہنا دیتے ہیں۔

اب اس بات کو تم یوں سمجھ لو، میں اپنی پیدائش کے وقت بالکل تنہا تھی۔ پھر رفتہ رفتہ میرا دامن بھرتا چلا گیا۔ ایک سے دو، دو سے چار اور چار سے سینکڑوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اتنے ہو گئے کہ مردم شماری کا علاحدہ دفتر کھولنا پڑا۔ میرا دامن تنگ ہوا تو چاند پر چڑھ دوڑے۔ گویا:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سچ تو یہ ہے کہ میں نے انسان کی عقل و دانائی کے وہ کارنامے دیکھے کہ چند صدیوں میں غاروں سے نکل کر چاند گاڑی میں آ بیٹھا ہے۔ حسن و عشق کی وہ وارداتیں بھی یاد ہیں کہ انسان نے تخت و تاج کو ٹھکرا کر کاسۂ گدائی کو اپنایا ہے۔ شعر و ادب کی لطافتیں بھی دیکھیں اور موسیقی کی سنگت سے بھی حظ اُٹھایا ہے۔ بنا کسی لعل و لیت کے انسان کو ہمیشہ ایک جہادِ مسلسل میں گرفتار دیکھا ہے۔ آگے بڑھنے کا جہاد، آگہی اور دریافت کا ایک جہادِ مسلسل۔ مقابلے بازی اور ہوس کاری کی جہت نے اس جہاد کو اور آگے بڑھایا ہے۔ کبھی اس خطے کے لوگ آگے نکل گئے، کبھی اس خطے کے۔ کچھ صدیاں شمال کی راجدھانی رہی تو کچھ زمانے جنوب کے تھے۔ اب دیکھو بنانے والا کب اس کھیل سے اُکتا جائے:

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہو گا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

مزے کی بات یہ ہے کہ ہر ایک واردات، ہر ایک واقعے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔





اس بات کو تم یوں دیکھو کہ ابھی کل کے اخبار میں ایک شخص کی کہانی تھی، جس نے نیاگرا فال میں کود کے خودکشی کر لی۔ اب اگر تم میری جگہ ہوتے تو دیکھتے کہ اس ایک قصے سے کس طرح درجنوں لوگ مختلف انداز سے متاثر ہوں گے۔ مرنے والے کی بیوہ کو انشورنس سے اتنا پیسہ ملے گا کہ اس کی بقیہ عمر خیریت سے گزر جائے گی۔ البتہ مرحوم ایک غریب خاندان کی چُھپ کے مدد کیا کرتے تھے، وہ اب مزید مالی بدحالی کا شکار ہوگا۔ بلکہ اسی خاندان کا ایک فرد تو علاج کی رقم نہ ہونے کے باعث قبل از وقت چل بسے گا اور میاں کہاں تک بتاؤں، تمھاری طرح باتونی تو ہوں نہیں۔ ایک نویں جماعت کا بچہ جو گھومنے آیا ہوا تھا، اس نے بھی یہ منظر دیکھا اور ذہن نے ایسا اثر قبول کیا ہے کہ اس کی تو شخصیت ہی بدل گئی اور ہاں جن صاحب کے پاس سیاحوں کی حفاظت کا ٹھیکہ تھا وہ اپنی نوکری سے گئے۔ اب ذرا میرے دماغی سکون کے بارے میں سوچو کہ ہر لحہ کہیں نہ کہیں میرے سینے پہ کوئی مرتا ہے، کوئی جیتا ہے، کوئی پیچھے رہ جاتا ہے تو کوئی آگے بڑھ جاتا ہے۔ کوئی شکاری ہے تو کوئی شکار ہوتا ہے اور اس میں ہر حادثے کے وہ، وہ اسباب ہیں یا رموز ہیں اور نتائج ہیں کہ میری تو سوچ سوچ کے رگیں پھولنے لگتی ہیں۔ اسی فشار الدم سے دریاؤں میں طغیانی آ جاتی ہے اور وہ سب اموات بھی میرے سر جاتی ہیں۔

یہ تم نے خوب پوچھا کہ مجھے اس میں سب سے زیادہ کیا بات کھٹکتی ہے۔ یادِ ماضی واقعی عذاب ہے۔ میاں یہ سب جو میرے سینے پر کودتے پھرتے ہیں، ستیاناس جائے ان کا۔ انھوں نے تو میرا چہرہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ ارے میاں...ایسی ہری بھری، تازہ ہوادار گودھی میری کہ چاند اور سورج بھی گرمی کھاتے تھے اور بہت گرمی لگتی تو گرہن کے وقت میرے سائے میں آ چھپتے۔ لیکن یہ اللہ مارے انسان، میں نے تو انھیں بچوں کی طرح پالا لیکن انھوں نے میرا وہ حشر کیا کہ خدا دشمن کا نہ کرائے۔ ایک خصلت جو میں نے ان میں نمایاں دیکھی اور میرے ذہن پر نقش ہو گئی ہے، وہ ہے ان کی وحشت۔ میں تو پہلے دن ہی کھٹک گئی تھی، جب یہ تازہ واردان بساطِ زمین ہوئے اور ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو مار کے دفنا دیا اور خدا سمجھے اس سیاہ پرندے سے۔ اس سے سیکھا کہ مردے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میری جڑوں میں تو اب صرف موت ہی رقصاں ہے۔ کیسے ہی حالات ہوں، کیسا ہی موسم ہو، کسی خطے کے لوگ کیوں نہ ہوں، وحشت میں کمی نہیں آتی۔ وہ، وہ میں نے جنگیں دیکھیں کہ جگر لہو روتا ہے اور کلیجہ پھٹ کر لاوا بہہ نکلا ہے۔ خاک وہ موئی نرگس اپنے بے نوری پہ روتی ہے۔ ایسے ہول ناک مناظر تو نہ دیکھنے پڑتے اور

یقین کرو ان میں سے زیادہ تر جنگیں بلا کسی عذر کے تھیں۔ بس ہوس کی حکمرانی تھی کہیں اور کہیں طاقت کا گھمنڈ۔ چار جوان جمع کیے، ایک پھریرے تلے، میدانِ کارزار جمایا اور چڑھ دوڑے دور دراز علاقوں پر۔ تم خود ہی انصاف کرو۔ بھلا گوروں کا ہندوستان میں کیا کام یا مسلمان اسپین میں کیا کر رہے تھے اور اس کام میں سب سے زیادہ تیز میری یہ گوری اولاد رہی ہے۔ وہ مار کٹائی، وہ بربریت، وہ وحشت کہ الامان۔ ایک ذرا سے بارود کے گولے سے ہزاروں کو یوں ختم کر دیتے ہیں گویا تھے ہی نہیں۔ میرے سینے پر گھٹنوں چلے۔ میں نے فصلیں اُگا کر انھیں پالا۔ میں نے مرنے کے بعد اپنی آغوش میں چھپایا اور انھوں نے نیوکلیائی بم میری کوکھ میں دے مارے۔ میں تو خود ایک آتشِ پوشیدہ ہوں لیکن مارگیتی اور دھرتی ماتا کہنے والوں نے یہ سب کچھ کیسے کر دیا اور یہ قصہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خوف ناک اور تباہ کن ہتھیاروں کی دوڑ میں ایک دوسرے سے ایسی مسابقت ہے... گویا اسی کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ تم میری زبان کھلواتے ہو اور خود سٹک لیتے ہو۔ میں ایک مزاج دار بڑھیا کی مانند بڑبڑائے جا رہی ہوں۔ کہاں کی بات تھی... کہاں نکل گئی۔ عالمِ بالا کی بات بالا خانے تک جا پہنچی۔ اسی لیے خاموش رہتی ہوں اور ان کہانیوں کو اپنے تک رکھ رہی ہوں۔ چھلکا در چھلکا پیاز کی مانند کھلتی جاؤں تو تم سب خود ہی شرما جاؤ گے۔ میں تو کہتی ہوں جیسے گزری ہے گزرنے دو۔ اتنا سوچنے اور فکر کرنے سے خواہ مخواہ ذہن پر دباؤ پڑتا ہے اور طبیعت میں گرانی آتی ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

میری تو صرف اتنی نصیحت ہے کہ اب نئی دنیاؤں کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سعی ہے۔ حالاں کہ تمھارے ہی نانا کی کہانی مشہور ہے کہ علاحدہ علاحدہ لکڑی آسانی سے ٹوٹ جاتی ہے۔ سب مل کر البتہ زیادہ مضبوط اور پائیدار ہو جاتی ہے۔ لیکن میاں تمھاری کوئی کل سیدھی ہی نہیں۔ اب ایک منہ زور جوانی ہے کہ جو اندھادھند بڑھ رہی ہے۔ میرے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ اب شباب کو قبل از وقت نہ زوال آ جائے۔

☆☆☆☆☆





# ہم جولی

رانو... اری رانو، تو کہاں مرگئی کم بخت؟

رانو کا بس چلتا تو وہ مر ہی جاتی۔ کم سے کم زمین ہی میں چھپ جاتی۔ جہاں اماں کی آواز اس کا تعاقب نہ کر سکتی۔ ویسے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اگر پاتال میں بھی جا بیٹھتی تو بھی اماں کی آواز ساتوں آسمانوں کو چیرتی، تیر کی طرح اسے ڈھونڈ نکالتی۔ وہ ہر جگہ چھپ کر دیکھ چکی تھی۔ باورچی خانے میں، طویلے میں، کھیت میں۔ یہ حد ہے کہ وہ آدھے کوس دور کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکال رہی ہو تو بھی اسے لگتا... جیسے اماں کی آواز وہاں بھی اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ نیند میں ایک ایسے محل میں بستی تھی جہاں اماں کی آواز اس محل کے دروازے ہی پر دم توڑ دیتی تھی۔ اس کے شب و روز مختلف کنکوؤں کی مانند تھے جنھیں اماں کی آواز نے ایک ڈوری سے باندھ رکھا تھا۔

''ابھی آئی ماں! باؤجی کو ناشتہ دے دوں۔''

''ناشتہ دے کر جلدی سے دودھ دوھ لے، ورنہ تیرا باؤجی اسے کھیت پر ساتھ لے جائے گا۔'' اماں نے دوبارہ ہانک لگائی۔

تین افراد پر مشتمل یہ گھرانا گاؤں کی جنوبی حد پر ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ اس کا ایک دروازہ سامنے پگ ڈنڈی کے منہ پر کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ زمین دار کے کھیتوں میں کھلتا تھا، جہاں رانو کا باپ ہمیشہ سے ایک ہاری تھا۔ ذرا بائیں جانب اسی پگ ڈنڈی سے ایک پتلا سا راستہ گاؤں کے کنویں کی جانب لے جاتا تھا، جہاں گاؤں کے بیشتر کسانوں اور ہاریوں کی زندگیاں اسی پگ ڈنڈی کی پیمائش میں ختم ہو جاتی ہیں۔ دروازہ سے کھیت اور کھیت سے دروازہ...... خودرو جھاڑیوں میں برسوں سے آتے جاتے قدموں سے یہ پگ ڈنڈیاں بن گئی تھیں۔ وہاں کول تار یا اینٹوں کی پکی سڑک بننے کی نہ کوئی امید تھی اور نہ ہی کوئی ضرورت۔ گھر کے پچھواڑے بانس اور گھاس پھوس سے بنا ایک چھپّر تھا، جس کے نیچے ایک بھینس بندھی رہتی تھی، جسے سب پیار سے

رانی کہتے تھے۔رانی کے دودھ سے اس گھر کی بہت سی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔مکھن اور پنیر اکثر ہاریوں کو ہضم نہیں ہوتا تھا، لہٰذا وہ زمین دار کے گھر چلے جاتے۔ دودھ، چھاچھ اور دہی رانو، اماں اور باؤجی کے حصے میں آتا۔رانو کو اکثر یہ محسوس ہوتا کہ باؤجی اور اماں، رانی کو اس سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔میں ان دونوں کے لیے کرتی بھی کیا ہوں؟ وہ اکثر سوچتی، رانی کم از کم دودھ تو دیتی ہے۔

گھر کی دیواروں پر باہر کی جانب اوپلے ایسے تھپے تھے، جیسے وہ مکینوں کی غربت کا مستقل اشتہار ہوں۔ وہ اوپلے سوکھ جاتے تو اسی چھپّر تلے ان کا ایک مینار سا بن جاتا۔ جاڑے کے دنوں میں ان اوپلوں کی آگ کے بغیر رانی پر کپکپی طاری ہو جاتی تو وہ ایک کھیس اوڑھے اپنے محل میں جا بستی۔ راہ گیر اس دیوار کے پاس سے گزرتے تو ان ہی اوپلوں کی بدبو کے باعث سانس روکنا پڑتی لیکن کیا کریں کہ یہی اوپلے ان کسانوں کی سانسیں جاری رکھنے کا ایک ذریعہ تھے۔

باؤجی اب تقریباً چالیس اور دو برس ادھر کو ہو چلا تھا، اس کا باپ دادا اسی زمین دار کے ہاری تھے۔زمانے بدل گئے، تقدیریں نہ بدلیں، نہ جانے کتنی نسلوں سے اسی زمین کے باج سے زمین دار گھرانے کی خدمت ہو رہی تھی۔ یہ تو موجودہ زمین دار کی ایک نیکی تھی کہ اس نے باؤجی کے باپ کے مرنے کے بعد زمین کا وہی ٹکڑا باؤجی کو کام کرنے کے لیے دے دیا تھا۔ باؤجی کا معمول تھا کہ وہ صبح کو فجر سے پہلے گندم اور باجرہ کی روٹی، گرم چائے کے ساتھ کھا کر کھیت کی جانب نکل جاتا۔ آندھی ہو یا طوفان، سورج آگ برسا رہا ہو یا جاڑے سے ہوا جم گئی ہو، باؤجی منہ اندھیرے کھیت میں موجود تھا۔موسم کے ساتھ اس کی مشقت کی نوعیت بدل جاتی تھی، کبھی بوائی کرنی ہوتی تھی تو کبھی کٹائی۔ یہ کام سارے سال چلتے رہتے۔کبھی کبھی دلار میں باؤجی رانی کو بھی کھیت پر لے جاتا۔ رانی سارا راستہ چارے پر منہ مارتی جاتی۔ نہ جانے ان گایوں اور بھینسوں کا پیٹ کبھی کیوں نہیں بھرتا۔ وہ اسے کھیت ہی میں ایک درخت کے ساتھ باندھ دیتا۔ باؤجی کو وہ بھینس بہت پیاری تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ رات کو اپنا بستر بھی رانی کے پاس چھپّر تلے ہی بچھوا لیتا۔ اسے تو اب یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے رانو کا نام بھینس پر یا بھینس کا نام رانو پر رکھا تھا۔

رانو کا بچپن اب جوانی کے دہلیز پر دستک دے رہا تھا۔ جیسے جیسے اس کا جسم بھرتا جا رہا تھا، باؤجی کی نیند سکڑتی جا رہی تھی۔ گاؤں میں لڑکیوں بالیوں کو تیرہ چودہ برس سے زیادہ گھر رکھنے کی روایت نہ تھی۔ ماشاالله اب رانو کا بھی چودھواں برس لگ چکا تھا۔ بیاہ کے لیے ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے پیسے کی۔ رانو کی مشقت کے اُفق پر ابھی ان دونوں کی شفق نہ پھوٹی تھی۔





پچھلی دونوں فصلیں اتنی خراب اُتری تھیں کہ لگان دینے کے بعد گھر میں صرف الله کا نام بچا تھا۔ وہ تو پھر زمین دار کی نیکی نے کام دکھایا کہ اس نے دونوں برس باؤجی کو اُدھار اناج دے دیا تھا۔ یوں اس کا گھر فاقوں سے بچ گیا۔اب اگر آیندہ دو نسلیں ان دونوں فصلوں کا اُدھار چکائیں تو اس میں زمین دار کا کیا دوش۔ حاضر حالات میں حجت نہیں ہوتی، قوموں اور ملکوں کی قسمت اکثر اسی معاشی مساوات سے رقم ہوتی ہے... باؤجی کی حیثیت ہی کیا۔

رانو نے باؤجی کو ناشتہ کرایا، بالٹی پکڑی اور باہر چھپّر کا رخ کیا۔ بالٹی زمین پر رکھ کر وہ پہلے کافی دیر تک بھینس کی پشت، گردن اور ران سہلاتی رہی۔ پتا نہیں اس میں بھینس کو زیادہ مزہ آ رہا تھا یا رانو کو رفاقت مل رہی تھی پھر اس نے بھینس کے آگے چارہ ڈالا اور بالٹی رکھ کر دودھ دوہنے لگی۔ چارہ کا خراج لیے بغیر بھینس بھی دودھ دینے پر راضی نہیں ہوتی۔ رانو صدیوں سے اسی طرح صبح نور کے تڑکے، گردن ایک طرف لٹکائے میکانکی انداز میں بھینس کا دودھ دوہ رہی ہے۔ اپنی اس افادیت سے بے خبر بھینس اتنی ہی صدیوں سے گردن جھکائے جگالی کر رہی ہے۔اس افادیت سے نہ جانے کتنے ہی کسانوں کے گھر چل رہے ہیں۔ دور سے دیکھنے پر یہ تمیز مشکل تھی کہ اس رفاقت میں رانو کون ہے اور رانی کون۔

رانو دودھ کی بالٹی اُٹھائے باورچی خانے میں چلی گئی۔ابھی اس میں سے مکھن نکالنا تھا پھر اماں پنیر اور چھاچھ زمین دار کے گھر پہنچا آتی۔ باؤجی نے نہ جانے کیوں سختی سے پابندی لگا رکھی تھی کہ رانو زمین دار کی حویلی سے دور رہے۔گزشتہ شب جمائی گئی دہی بلو کر روٹی کے ساتھ باؤجی کو کھیت پر دے کر آنا اور واپسی میں کنویں سے پانی نکالنا بھی رانو کا روزمرہ کا معمول تھا۔ باؤجی اندھیرا ہونے سے پہلے کھیت سے واپس آ جاتا۔ کچھ دیر حقہ گڑگڑاتا اور رات کو تینوں مل کر کھانا کھاتے، جلدی سو جاتے۔ یہ تھا اس گھرانے کا روزمرہ کا معمول، رہٹ میں بندھے بیل کی طرح ان کا معمول بھی صرف خارجی عوامل سے ہی بدلتا تھا۔

آج باؤجی گھر واپس آیا تو وہ بہت جوش میں تھا۔

''رانو کی ماں، رانو کی ماں''، اس نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور سے آواز لگائی۔

''اِدھر ہی ہوں بابا، ایسے کیوں چلاتے ہو؟'' اماں نے باؤجی کی چلم تازہ کی پھر دونوں صحن میں پلنگ پر کھیس بچھا کر بیٹھ گئے۔

''اری وہ کمّی آیا تھا، اپنے بھائی کے ساتھ۔'' باؤجی نہ جانے کیوں سرگوشی کر رہا تھا۔

’’تو‘‘ اماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

’’اری تو کی بچی... تیری تو عقل ماری گئی ہے۔ وہ اپنے بھائی کے واسطے رانو کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔‘‘ باؤ جی غصے میں آ کر یہ بھول گیا تھا کہ وہ سرگوشی میں بات کر رہا تھا۔ یوں رازداری کی بات ایک اعلان بن گئی۔

’’مگر اس کی عمر کتنی ہے۔‘‘ اماں نے سوال کیا۔

’’اری عمر کا کیا ہے۔ چالیس سے پورے تین کم ہیں۔ تین کوس پر حاجی کریم صاحب کا جو گاؤں ہے اس میں ہاری ہے۔ اللہ نے بڑی مشکل آسان کی ہے۔‘‘ باؤ جی بے تکان بول رہا تھا۔

’’عقل میری ماری گئی ہے یا تیری؟ باؤلا ہوا ہے۔ چالیس میں تین کم یعنی تیرے سے صرف تھوڑا ہی چھوٹا۔ اپنی رانو کا ہاتھ تین گنا عمر کے آدمی کے ہاتھ میں دے دوں؟‘‘ اماں بولیں۔

رانو کو باورچی خانے کی حدت کے باوجود ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ ’’کاش باؤ جی یہ بات سرگوشی ہی میں کرتا رہا‘‘ رانو کا دل جیسے حلق میں اُمڈ آیا۔

’’ارے بابا عمر کا کیا ہے۔ وہ بڑے زمین دار کا ہاری ہے، رانو راج کرے گی۔ پھر پاس کے گاؤں میں ہوگی اور وہ صرف پندرہ سو روپے مانگ رہا ہے، تو نے اپنی اور میری عمر دیکھی ہے۔ کسی وقت مر گئے تو اس نیک بخت کا کیا ہوگا؟‘‘ باؤ جی نے اماں کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔

’’ایک تو باؤ جی کو نہ جانے مرنے کی کیا جلدی ہے؟‘‘ رانو نے دکھ سے سوچا۔ ’’اچھا خاصا ہٹا کٹا تو ہے، اس کھوسٹ کے ساتھ میرا بیاہ کرنے کی کیا جلدی ہے اس کو؟‘‘

’’لیکن یہ پندرہ سو روپے آئیں گے کہاں سے؟‘‘ اماں کی مزاحمت کم زور پڑ رہی تھی۔ باؤ جی کا جواب اتنا آہستہ تھا کہ رانو کو سنائی نہیں دیا۔

’’کیا بول رہا ہے، رانی کو بیچ دیں گے تو ہم کھائیں گے کیا؟‘‘ اماں کی خوف اور حیرت میں گندھی آواز آئی۔ لہجہ ایسا شاکی تھا کہ جیسے کہہ رہی ہو، تم سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔

باؤ جی کی آواز بھی اب یاس بھرا نوحہ تھی۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا، ’’تو ہمارے پاس اور کیا رستہ ہے‘‘ رندھی ہوئی آواز جاری رہی۔ ’’زمین دار کے پاس گیا تو وہ پہلے کا قرضہ مانگے گا۔ اس دروازے کو بند ہی سمجھ۔ ہم دو بندے ہیں، گزارا کر لیں گے۔ پھر رانو اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ اچھی طرح سوچ لے۔ جوان بندہ ہے ہم نے جواب نہ دیا تو کہیں اور کا رخ کر لے گا‘‘ باؤ جی سب باتوں کا حساب کر چکا تھا، ان کم زور حیلوں بہانوں سے اس کا ارادہ بدلنے والا نہیں تھا۔





اس رات تو یہ بات وہیں ختم ہوگئی مگر پھر روزانہ اس بات کا تذکرہ ہونے لگا۔ پہلے دھیرے دھیرے کانا پھوسی میں اور جب باؤ جی اور اماں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ رانو اور رانی کے علم میں یہ بات آ چکی ہے اور زندگی اسی ڈھب سے چل رہی ہے اور کوئی بھونچال نہیں آیا تو مشورے زیادہ کھل کر بلند آواز سے ہونے لگے۔ اماں نے رانو کو ہدایت کر دی تھی کہ بھینس کا چارا بڑھا دے۔ جب رانو نے تیوڑی چڑھا کر پوچھا کیوں؟ تو اماں نے یہ کہہ کر رانو کا منہ بند کر دیا۔ ’’کہیں ایسا نہ ہو، اس درمیان بیمار پڑ جائے۔‘‘

فصل کی کٹائی کے چوتھے روز شادی کی تاریخ پڑ گئی۔ باؤ جی نے اپنے رشتہ دار ہاریوں اور کمیوں کو اطلاع کر دی۔ رانی کھا کھا کر اور موٹی ہو رہی تھی جب کہ رانو کو اندر ہی اندر کوئی گھن لگ رہا تھا۔ اس بار باؤ جی نے کٹائی میں اس سے کام بھی نہیں لیا تھا۔ ’’بس رانو... اب اپنے کھیت میں جا کر کام کرنا‘‘ باؤ جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے درانتی لے لی۔ کٹائی کا جشن خوب رہا رانو کے گھر پر ایک ہاری نے قمقموں کی ایک لڑی کی لہریں بنا دی تھیں۔ کمی نے نہایت فراخ دلی سے ایک جرنیٹر بھی لا کر رکھ دیا تھا، شادی کے لیے۔ اس سے آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے ایک بلب روشن ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی دروازے اور دیوار پر قمقموں کی لڑی میں نیلی، پیلی اور لال بتیاں ایسے جل بجھ رہی تھیں، جیسے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی ہوں۔ کبھی رانو آگے نکل جاتی کبھی رانی۔

آج صبح اماں نے رانو کو سرخ جوڑا پہنا کر خوب تیار کیا تھا۔ بارات شام کو آنا تھی۔ رانو کا خصم پورے چوبیس آدمیوں کی بارات کے ساتھ آ کر رانو کو ساتھ لے جانے والا تھا۔ رانو نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باؤ جی کمی کے ساتھ کسی آدمی سے بول بھاؤ کر رہا تھا۔ اس آدمی نے سولہ ہرے نوٹ نکال کر باؤ جی کو دیے جو اس نے اپنے نیفے میں اڑس لیے۔ باؤ جی نے رانی کی رسی کھول کر اس آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دی اور ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں یوں صاف کیں جیسے ان میں کچھ پڑ گیا ہو۔ رانو کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ رانی بڑی شان سے گھسٹتی اس اجنبی آدمی کے پیچھے جا رہی تھی۔ رانو کو ایسا لگا، جیسے رانی نے مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا اور اس کی موٹی کالی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک کر پگ ڈنڈی کی زمین میں نم کر گیا۔ رانو کو اس وقت بھی ایسا لگا، جیسے رانی ایک بار پھر اس سے جیت گئی ہو۔ باؤ جی نے یقیناً سولہ نوٹ اپنے نیفے میں اڑسے تھے جب کہ رانو کے شوہر نے صرف پندرہ نوٹوں کا مطالبہ کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

# ابدی کھیل

تنکا تنکا کر کے ہی گھر بنتا ہے۔ اگر ضرورت اشد ہوتو پھر یہ قید بھی نہیں کہ تنکا کہاں سے اُٹھایا۔ بس گندی نالی کے تنکوں سے پرہیز لازم ہے۔ کچھ یہی طریق تعمیر ابابیل نے اپنایا تھا۔ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب، ہر منطقے سے پتلے، موٹے، مختلف لمبائی کے تنکے اپنی چونچ میں لا لا کر وہ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر آشیانہ بنا رہی تھی۔ جب اپنا گوشۂ عافیت بنانا منظور ہوتو سب سے اونچی شاخ ہی بہتر ہے کہ زیادہ سے زیادہ بدنظروں کی دست گاہ سے محفوظ رہے۔ ابابیل کا یہ نسل سازی کا زمانہ تھا۔ انڈے دے کر انہیں کسی محفوظ مقام پر گرمائش پہنچانے کی قدرتی لگن اسے مصروف رکھتی تھی۔ یہ بھی ملحوظِ خاطر تھا کہ یہ تو فقط پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد ننھی جانوں کی پرورش اور انہیں آلامِ زمانہ سے بچانا زیادہ دشوار مرحلہ تھا۔ اسی جدوجہد سے یہ خانہ سازی اپنی منزل کو پہنچ رہی تھی۔

ابابیل اس اژدر سے واقف تھی جو درخت کی کھوہ میں اس دن کا منتظر تھا کہ ابابیل کے انڈوں سے بچے نمودار ہوں اور اس کی شکم پُری کا سامان بنے۔ اگر اژدر کے بس میں ہوتا تو خود ابابیل کو تنکے جمع کر دیتا۔ کسی کے بنے بنائے گھر کو اُجاڑنے میں ایک طاقت، زعم اور زور آوری کا کمال ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ جس کا گھر اُجاڑا جائے وہ اتنا کم زور ہو کہ بدلے میں کچھ بھی نہ کر سکے۔ اگر جوابی حملے کا اندیشہ ہوتو اکثر دانا سپہ سالار حملہ کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ غنیم جتنا کم زور اور مجبور ہو... اتنا ہی لقمۂ تر ہوتا ہے۔

ایسا نہیں کہ اژدر کی اپنی زندگی کوئی پھولوں کی سیج تھی۔ آئے دن نیولے سے اس کی جھڑپ





چلتی رہتی۔ کبھی اس کا پلّہ بھاری اور کبھی اس کا۔ اسی باہمی چپقلش میں دونوں ابھی تک ابابیل کو بھرپور توجہ نہیں دے سکے۔ دونوں برابر کے موذی تھے۔ صرف دنیا کا ہی نہیں، جنگل کا دستور بھی یہی ہے کہ اگر غنیم طاقت میں برابر کا ہوتو ایک غیر قدرتی امن قائم ہو جاتا ہے جو کسی بھی لمحے ایک فریق کی کم زوری سے درہم برہم ہوسکتا ہے۔ ایسی ہی فضا اژدر اور نیولے کے درمیان تھی۔ تناؤ، چوکسی اور بے اعتباری کی فضا۔ جب کبھی نیولا اژدر کو سوتا پاتا تو دبے پاؤں شب خون مارنے کی کوشش کرتا۔ اژدر بھی گویا ایک آنکھ کھول کر سوتا تھا۔ ہمیشہ خطرے کی بو اسے فاصلے سے آجاتی کہ وہ درخت پر چڑھ جاتا۔ نیچے نیولا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا، دانت اور ناخن تیز کرتا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

ان ہی موذیوں کے درمیان ابابیل بھی اپنی بقا کی جنگ میں مشغول تھی۔ کسی ایک موذی کا ساتھ دینا دوسرے کے غضب کو آواز دینے کے برابر تھا۔ یہ بغض ابابیل کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا۔ پھر بھی کیوں کہ اسے اژدر سے زیادہ خطرہ تھا، اس لیے اس کی ہم دردیاں جیتنے کی کوشش کرتی۔ کبھی نیولا دبے پاؤں درخت کی کھوہ کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ابابیل کی بے وقت راگنی سے ہوشیار ہو جاتا۔ ایسا نہیں کہ نیولا اس کی ان حرکتوں سے بے خبر تھا، بس بے بسی تھی کہ درخت پر چڑھنے کے گُر سے ناواقف تھا۔ لیکن ابابیل نے اس کی آنکھوں میں غیض و غضب اور نفرت کی جھلک دیکھ رکھی تھی کہ تنکا اُٹھانے سے پہلے دائیں بائیں، ہر جانب نیولے کے نہ ہونے کا یقین کر لیتی۔ کبھی کبھی تو عین اس وقت جب دونوں موذی سر بہ گریبان ہوں، ابابیل لپک کر کوئی پاس کا تنکا لے اُڑتی۔ ایسا کر کے اسے خاص راحت ہوتی اور وہ اپنی اس ہوشیاری پر پھولے نہ سماتی۔ ایسا ہرگز نہیں کہ تینوں سکون سے نہیں رہ سکتے تھے، اژدر کے لیے اور بھی کئی سامانِ کام و دہن تھے اور نیولا تو ہر جھاڑی میں جا گھستا۔ اس کو تو خوراک کی کمی نہیں تھی لیکن طاقت کا نشہ، تسخیر کا شوق اور حکمرانی کا خواب دونوں کو کشت و خون میں غلطاں رکھتا۔

جیسے تیسے، اللہ اللہ کر کے ابابیل کا گھونسلا تیار ہو ہی گیا۔ اس بات کا قلق رہا کہ کئی مضبوط اور خوش نما تنکے جو آشیانے کی خوش نمائی اور دیرپا بنیادوں کا سہارا بنتے، ان موذی اژدر اور نیولے کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکے۔ بس دور ہی سے مسرت سے ان تنکوں کو دیکھتی جاتی جو قدرت نے اس کی دسترس میں مہیا کیے تھے۔ وہ نیولے اور اژدر کے کسی کام کے نہیں تھے لیکن ابابیل اس انجام سے واقف تھی جو تالاب میں اُن مچھلیوں کا ہوتا ہے جو مگرمچھ سے بیر مول لیں۔

گھونسلا بننے سے ابابیل کے شب و روز میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ اب اس کا زیادہ وقت اپنے آشیانے میں گزرتا۔ دونوں موذیوں سے بے نیاز اپنے نشیمن کی تعمیر و ترقی میں مشغول۔ پھر ایک صبح تڑکے ایک دو نہیں، پورے چھ عدد انڈے دے ڈالے۔ انڈے دینے کا عمل بھی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے۔ گویا احساس دلا رہی ہو کہ اگر 'کن' پر کچھ شبہ ہو تو دیکھو یہ زندہ کرشمہ دکھاتے ہیں۔ ایک بند کٹوری جس میں ہوا کے گزرنے کا شائبہ نہ ہو اس میں سے آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ کے ایک جان دار ایسا نمودار کریں جو اپنی باری آنے پر یہی عمل اسی خوش اسلوبی سے دہرائے۔ اس بند کمرے میں وہ ننھی جان کس طرح زندہ رہتی ہے، یہ تو ابابیل سے پوچھیے یا اس کے خالق سے۔

انڈے دینے کے بعد تو ابابیل نے گویا بالکل گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ گھنٹوں انڈوں پر بیٹھتی، ان کو اپنے بدن کی گرمی سے سیتی۔ یہ بہت خطرناک وقت بھی تھا۔ اژدر نے بھی انڈوں کی مہک سونگھ لی تھی۔ انڈوں میں بند ننھی جانوں کی لذت سے وہ پہلے بھی واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ کئی دفعہ کوشش کی کہ شب خون مارے مگر ابابیل اتنا ہنگامہ اُٹھاتی اور چونچ مارنے کی کوشش کرتی کہ اژدر ایسے موذی کو بھی ہمت نہ پڑتی۔ سچ ہے اگر اپنی نسل خطرے میں ہو اور اپنا آشیانہ لٹنے کا امکان ہو تو ہر نفس اپنے سے بڑی جان سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔ اژدر اسی تلاش میں تھا کہ کسی ایسے وقت شکار کرے جب ابابیل گھونسلے میں نہ ہو۔ کھوہ سے نکلتے وقت کم بخت نیولے پر بھی نظر رکھنی پڑتی۔ اس باہمی چپقلش کا فائدہ صرف ابابیل کو پہنچ رہا تھا۔

اژدر کے بار بار کے حملے آخر رنگ لے ہی آئے۔ ایک دن ابابیل کو گھونسلے میں واپس آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ سہ پہر نکلی تھی، دانہ دنکا کھانے، شام واپسی سے پہلے اس زور کا مینہ برسا کہ دونوں پر من من کے ہو گئے۔ ذہن کے ہر گوشے میں اس خطرے کا احساس تھا جو اس کے نشیمن کے عین نیچے پل رہا تھا۔ اس بارش نے اس دن نہ جانے کتنے پرندوں کے گھونسلے اُجاڑے ہوں گے؟ بدن تھکن سے چور، دل سینے میں اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ مانو ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے۔ مگر جسم و جاں کے آخری ذخیروں کو کام میں لا کے ابابیل گھونسلے تک آ پہنچی۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ اژدر سب سے اونچی شاخ پر آ پہنچا ہے اور انڈوں کو نگلا ہی چاہتا ہے۔ ابابیل نے شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ جسم کی تھکن جیسے اچانک غائب ہو گئی۔ عقاب کی مانند اوپر اُٹھی اور چاہا کہ اژدر کے پھن پر چونچ مارے۔ ایک کم زور کو عذاب میں دیکھ کر دوسرے پرندوں بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ چوں چوں کہ الاماں! اژدر نے گھونسلے پر منہ مارا لیکن جلد بازی میں





انڈے نگل نہ سکا۔ گھبرا کر فرار کی راہ اختیار کی۔ چور کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، گھر والوں کی بیداری دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ انڈے تو اسے نصیب نہ ہوئے لیکن کم بخت نے گھونسلے پر ایسا جھپٹا مارا کہ گھونسلا شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔ اب تو نیولا بھی اپنی کمین گاہ سے باہر آ گیا۔ مالِ غنیمت سامنے تھا۔ قدرت کے کھیل دیکھیے کہ اسی وقت کھٹ کھٹ چار انڈوں سے یکے بعد دیگر ننھے ابابیل نمودار ہوئیں۔ گویا کسی پروگرام کے تحت سب ایک ساتھ لقمۂ اجل بننے کو تیار تھے۔ بعینہ دو انڈے گھونسلا گرنے سے ٹوٹ گئے اور گو ان انڈوں کے چھلکوں سے انگوٹھے کے ناپ کی ابابیل نظر تو آ رہی تھیں مگر ان کے جسم کسی چلبلاہٹ سے عاری تھے۔ اتنی بلندی سے گرنے سے دو نومولود ابابیل شاید انڈوں کے باہر کی دنیا میں پہلی سانس بھی نہ لے سکیں۔ باقی چاروں کی سانسیں بھی چند لمحوں کی مہمان تھیں۔ نیولا اور اژدر، دونوں اپنی کمین گاہوں سے باہر آ گئے۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تر نوالہ سامنے تھا۔

مسئلہ فقط یہ تھا کہ دشمن سے نظریں ہٹا کے گھونسلے کے مکینوں کو نگل لیں تو خود نوالہ نہ بن جائیں۔ پیڑ کی شاخ سے ابابیل کی چوں چوں اب بے اثر تھی۔ آوازِ غیض و غضب کے بحران سے گزر کر احتجاج اور فریاد کے دائرے میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نیچے زمین پر گرے گھونسلے پر آ بیٹھی کہ گویا اس سے اژدر یا نیولا ڈر جائیں گے۔ مگر اس خیالِ محال نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ نیولے اور اژدر، دونوں کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اچانک مالِ غنیمت کی قدر و قیمت دوگنی ہو گئی۔ تا حال ابابیل اور اس کے چاروں بچوں کی زندگی میں ساجھے داری برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہ بات گویا نیولے اور اژدر کو بروقت سوجھ گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے پر سے نظریں ہٹائیں اور گھونسلے پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے طاقت ور غنیم کے سامنے ابابیل کے بچے نوالہ ثابت ہوئے۔ چند ثانیوں میں گھونسلا خالی تھا۔ اژدر نے اپنی روایتی چالاکی اور حرص سے دو بچے ایک ساتھ نگل لیے۔ یہ لقمہ اس عفریت کے ظرف سے زیادہ بڑا ثابت ہوا اور اس کے حلق میں پھنس گیا۔ اب اژدر کی حالت دیکھنے والی تھی۔ کبھی زمین پر سر مارتا اور کبھی کروٹ کروٹ لوٹنے لگتا۔ نیولا چند لمحے تو اژدر کی اس کم زوری سے غافل رہا کہ اپنے طعام میں مصروف تھا۔ لیکن جیسے ہی نیولے کی نظر جان کنی میں مبتلا اژدر پر پڑی، وہ ابابیل کے باقی دونوں بچوں کو سالم نگل کے، اژدر پر ٹوٹ پڑا۔ ہوس جانور کو بھی اندھا کر دیتی ہے۔ اس افراتفری میں نیولا بھول گیا کہ منہ ابھی پچھلے شکار سے بھرا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اژدر پر اس طرح دانت نہ گاڑ سکا جو جان

لیوا ثابت ہوتے۔ اژدر نے بھی جس کی تڑپ اور جدوجہد اب آخری سانسیں لے رہی تھی، گویا اپنی بچی کھچی طاقت کو صرف کر کے نیولے کی گردن کے گرد ایسا شکنجہ ڈالا کہ نیولے کی سانس کا ربط رک گیا۔ اب دونوں موذی گتھم گتھا زمین پر تڑپ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں دونوں کے جسم ساکت ہو گئے۔ درخت کی مختلف شاخوں پر موجود پرندوں کی چہکار نے ایک بار پھر آسمان سر پر اُٹھالیا۔ گویا قدرت کے نرالے کھیلوں کی مدح سرائی کر رہے ہوں۔

☆☆☆☆☆





# آخرِ شب

کھڑکی سے چھن کر آنے والی سورج کی روشنی مدھم ہونے کے بعد اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔ کمرے میں مہیب اندھیرا تھا۔ برآمدے کی روشنی سے چیزوں کے خاکے اخذ کیے جا سکتے تھے ورنہ برآمدے کے بلب میں روشنی ہونے سے پہلے تو کمرے کا اندھیرا بالکل قبر کی مانند محسوس ہوتا تھا۔ جیسے قبر سے کسی قبر نما کی مشق کی جا رہی ہو۔ اکرام کو جھرجھری سی آ گئی۔ کسی نامعلوم خوف کی ایک سرد لہری سی پورے جسم میں دوڑ گئی۔ سارے دن میں اسے یہ وقت سب سے زیادہ ڈراؤنا اور تنہا لگتا تھا۔ جیسے دونوں مل کر اس کی تنہائی اور بے بسی کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ نرسنگ ہوم کی دن کی شفٹ ختم ہو چکی تھی۔ رات کی شفٹ میں اِکّا دُکّا نرسیں جلدی جلدی کام نبٹا کر اپنے اسٹیشن پر گپ لگانے یا کتاب پڑھنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اکرام کو لگا جیسے کمرے کے سامنے سے کوئی گزر رہا ہو۔

''نرس!'' اس نے بے چارگی سے آواز دی۔ شاید اس نے سنا نہیں۔ اکرام کو خود ہی اپنی تسلی جھوٹی اور کھوکھلی لگی۔ مگر اس جھوٹی تسلی میں اس کی اَنا کی تسکین تھی۔

وہ پیشاب میں تر بہ تر تھا۔ تقریباً تین گھنٹے بیت چکے تھے۔ اب اسے اپنی ذات سے بھی بو اُٹھتی محسوس ہوتی تھی، جیسے اس کے خمیر کو پیشاب سے گوندھ دیا گیا ہو۔ تین طویل گیلے گھنٹے۔ دن کی ڈیوٹی والی نرس اسے صاف ستھرا کرنے اور ڈائپر بدلنے کے بجائے یہ کام رات کی نرس پر چھوڑ گئی تھی۔ اکرام نے کوشش کی کہ اپنے فالج زدہ بدن کو ایک کروٹ دے دے تاکہ اس گیلی حساسیت سے بچ سکے۔ گیلا بستر اس ہول ناک بے چارگی کو اور تقویت دیتا تھا۔ پوری کوشش کے باوجود وہ شاید ایک انچ سرک پایا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ذہن بھٹک کر کئی دہائیوں پیچھے چلا گیا۔

غالباً چاندرات تھی۔ اکرام کی سالی اور ہم زلف عید منانے خیر پور سے کراچی آ گئے تھے۔ اکرام کا ڈیفنس میں گھر کیا تھا...ایک محل تھا۔ پیسے کی فراوانی تھی۔ گھر میں ہر وقت تین گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ رات اور دن اکرام کے تھے۔ قسمت کی دیوی ایسی مہربان کہ مٹی کو ہاتھ لگائے تو سونا۔ اس مادی کامیابی نے جہاں دنیا بھر کی آسائشیں مہیا کر دی تھیں...وہیں اس کی طبیعت میں غرور وانانیت کے جراثیم نے جگہ بنالی تھی۔ ناک پر مکھّی نہ بیٹھنے دیتا۔ اکرام کی بیوی نے شرارت سے اپنے بھانجے کو اکرام کی گود میں ڈال دیا۔ سالی اور ہم زلف کی موجودگی میں اکرام نے طوعاً و کرہاً بچے کو اُٹھالیا اور پیار کرنے ہی لگا تھا کہ بچے کے پیشاب سے اکرام کی قمیض گیلی ہوگئی۔ غصے سے آگ بگولہ ہو کر اکرام نے اس زور سے بچے کو پٹخا کہ غریب گھنٹوں روتا رہا۔ بہت بدمزگی رہی۔ اکرام کو اپنی سالی کی نگاہیں اب تک یاد تھیں۔ جیسے خبردار کر رہی ہوں کہ ایسا نہ ہو ایک دن اسی طرح تھل تھل پڑے ہوئے ہو، یہی سوچتے سوچتے اکرام کو جھپکی آ گئی۔

آنکھ کھلی تو رات کا عفریت اسی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ سناٹے میں گاہے بہ گاہے کسی نرس کی سرگوشی سنائی دے جاتی یا کبھی کسی دواؤں کی الماری کے کواڑ بند ہونے کی۔ دن کے ہنگاموں میں تو یہ آواز محسوس بھی نہیں ہوتی تھی مگر قیامت کے اس سناٹے میں تو سوئی گرنے کی آواز بھی نرسنگ ہوم کی خاموشی کو چیرتی ہر کونے تک پہنچ جاتی۔ اکرام کو ہر آواز، ہر وہم بہت دل کش محسوس ہوتا۔ جیسے واپس زندگی کی طرف کھینچ رہا ہو۔

انسان کو فالج ہو تو بہتر ہے، اس کی سماعت اور ہوش وحواس بھی جاتے رہیں۔ آگہی کا یہ کرب بہت جان لیوا ہے۔ اکرام نے سوچا۔

سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ جب سے دایاں ہاتھ مفلوج ہوا تھا۔ نرس ایک ٹرالی اس کے بائیں ہاتھ رکھ دیتی تھی، جس میں پانی کا گلاس، کبھی دوا، کوئی رسالہ یا اخبار رکھا ہوتا۔ اکرام نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں اپنی بائیں جانب ٹٹولا مگر ٹرالی ندارد۔ جھلا کر اور آس پاس ہاتھ مارا مگر......غلطی سے نرس نے ٹرالی دائیں ہاتھ پر ہی چھوڑ دی تھی۔

''نرس! نرس!!'' خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اکرام نے ایک بار پھر آواز لگائی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ کافی دیر انتظار کے بعد بھی جب کوئی نہ آیا تو اکرام نے کوشش کی کہ بایاں ہاتھ جسم کے دوسری طرف گھما کر ٹرالی سے پانی اُٹھالے۔ بروقت ہاتھ پہنچ تو گیا مگر بدقسمتی سے گلاس پر ایسا ٹکرایا کہ گلاس زمین پر گرا اور چھن سے ٹوٹ گیا۔ پانی کا آسرا بھی گیا۔ پیاس سے زیادہ اکرام کو





اپنی بے چارگی کا احساس مارے جا رہا تھا۔ انسان اپنی تمام تر رعونت اور کروفر کے باوجود کسی اور کا اتنا محتاج ہو جائے کہ ہاتھ بڑھا کر ایک گلاس پانی کا نہ اُٹھا سکے؟ بے بسی سے اس کی آنکھ میں آنسو بھر آئے۔ وہ جو ناک پر مکھّی نہیں بیٹھنے دیتے تھے...آج ہاتھ ہلا کر ناک سے مکھّی نہیں اُڑا سکتے۔ اپنی بے حیثیتی اور بے چاری کا لاشعوری احساس تو اسے فالج کے پہلے دن ہی ہو گیا تھا۔ مگر چھوٹی چھوٹی ضروریات اب اس کے شعور پر تازیانوں کا کام دینے لگی تھیں۔ ذہن کے پردے پر پھر برسوں پرانی ایک یاد اُبھر آئی۔

یہ اس کے نیویارک آنے سے چند برس پہلے کی بات تھی۔ ڈیفنس میں اگر آپ کے پاس پیسے کی فراوانی نہیں بھی ہو تب بھی ایک دو نوکر تو ویسے ہی مل جاتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو صاحب کا بچا کھچا کھانا اور کپڑا ہی ملتا رہے گا۔ کم از کم غریب گھر سے ایک پیٹ تو کم ہو گا اور اگر آپ کے پاس اکرام جیسا پیسہ ہو تو نوکروں کی ریل پیل ہونا جیسے ایک فطری عمل ہے۔ جوتے پہننے ہوں تو نوکر لا کر سامنے رکھ دے گا فقط پیر ڈالنے کی زحمت ہے۔ پیاس لگنے سے پہلے ہی نوکر ٹھنڈے پانی کا گلاس لیے حاضر ہے۔ جنات کی ایک ٹولی ہے جو آپ کی ضرورت زبان تک آنے سے پہلے ہی پورا کر دیتی ہے۔

فیکٹری سے واپسی پر اکرام کا موڈ سخت خراب تھا۔ ایک نئی شوگر مل کا پرمٹ اس کے بجائے سیکرٹری صاحب کے بھانجے کو جاری ہو گیا تھا۔ گو اکرام نے اپنے تئیں دامے، درمے موافق فضا باندھ دی تھی۔ گھر میں گھس کر بیگ پھینکا۔ ٹائی ڈھیلی کی اور ٹی وی کے سامنے ڈھیر ہو گیا۔

''رشیدہ...ذرا پانی تو پلا۔'' اس نے ملازمہ کو آواز دی۔

تیرہ سالہ رشیدہ نے فریج سے ٹھنڈا پانی گلاس میں بھر کے خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ اکرام کی نگاہیں ٹی وی پر جمی تھیں۔ بغیر نظریں ہٹائے گلاس لینے کی کوشش کی تو گر کر چکنا چور ہو گیا۔ کیسے کمینوں کو بھر رکھا ہے تم نے! اکرام نے دھاڑ کر گویا بیوی سے شکایت کی جو وہاں موجود بھی نہیں تھی۔ گھبرا کے رشیدہ زمین سے شیشے کے ٹکڑے جمع کرنے لگی تو انگلی ایسی کٹی کہ بھل بھل خون بہنے لگا۔

''اب دفع بھی ہو یہاں سے۔ قالین بھی خراب کرے گی۔'' اکرام نے بے زاری سے منہ موڑ لیا۔

شاید نرسوں کی باتوں کی آواز سے پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ دو نرسیں اب بالکل اس کے کمرے کے باہر باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے

سائے دروازے سے دیکھے جاسکتے تھے۔ اکرام کو امید کی کرن نظر آئی۔

''نرس! نرس!'' اس نے بچی کھچی قوت جمع کر کے آواز دی۔ نرسوں کی باتیں کرنے کی آواز رک گئی۔ اک لمحے کے وقفے کے بعد باتیں پھر شروع ہو گئیں۔ ''کم بخت بڈھا مرتا بھی نہیں'' ایک نرس نے اتنی زور سے سرگوشی کی کہ اس تک ضرور پہنچ جائے۔ اکرام کے ذہن پر جیسے ہتھوڑے برسنے لگے۔ نہیں فالج کے ساتھ میرا دماغ بھی چل گیا ہے اور سماعت بہک رہی ہے۔ اکرام کی روح جیسے احتجاج کر رہی تھی۔ مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں مگر میرے بس میں کہاں ہے؟ اب اس نے نرسوں کو آواز دینا چھوڑ دیا۔ پیاس اور کم زوری سے ویسے بھی ذہن اب ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں معلق تھا۔ بجائے ایسے میں بھٹک کر بار بار کیوں پرانی یادوں کی راکھ کریدی جا رہی تھی۔

اس کا ڈرائیور کئی ہفتوں سے کھانس رہا تھا۔ اکرام کے پاس تو اس طرف دھیان دینے کی فرصت بھی نہیں تھی مگر بیوی نے توجہ دلائی کہ کہیں ایسا مرض نہ ہو جو بچوں کو...... ''اتنا کھانس کیوں رہا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتا؟'' اکرام کی گفت گو کا انداز ایسا تھا جیسے دوسرے انسان سے نہیں کسی کم تر مخلوق سے بات کر رہا ہو۔

''دکھایا تھا صاحب! اس نے ٹی بی بتایا۔ دوائیں لکھ کر دی ہیں، مگر اتنی مہنگی دوا۔ امارے بس سے باہر ہے صاحب! خود دوا کھالوں تو گاؤں کیا بھیجوں؟'' پٹھان ڈرائیور کے لہجے میں مایوسی تھی مگر دور کہیں ایک موہوم سی امید کی کرن بھی کہ شاید اکرام اسے دوا دلوا دے۔ آخر پچھلے بارہ سال سے وہ ان کی خدمت کر رہا تھا۔ حالاں کہ ان بارہ سالوں کا تجربہ...... کسی ایسی امید اور سوچ پر عرصہ ہوئے مایوسی کا تالا لگا چکا تھا۔ اسی لیے ڈرائیور نے خود اکرام سے بات نہیں کی تھی۔ ''ارے تو کہیں اور جا کر کیوں نہیں مرتا۔ کم بخت یہاں ہی کھوں کھوں کر رہا'' اکرام نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا، جیسے نادانستہ اپنے اور ڈرائیور کے درمیان فاصلہ بڑھا رہا ہو۔ ''مرنا جینا اپنے ہاتھ میں کہاں ہے صاحب؟'' ڈرائیور کو جیسے بیماری نے بے خوف بنا دیا تھا۔ ''تیرے ہاتھ میں نہیں... میرے ہاتھ میں تو ہے۔'' اکرام نے یہ کہہ کر ڈرائیور کو گیراج سے باہر دھکیلا اور اس کے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ ''اب ایک منٹ یہاں سانس لینے کی ضرورت نہیں۔ کل رشیدہ بقایا پیسے دے آئے گی۔'' اکرام نے پیچھے سے آواز لگائی۔

پتا نہیں یہ اس سوچ کی جھرجھری تھی یا نرسوں کی باتوں کی کہ اس کی نیند پھر ٹوٹ گئی۔ ''کم بخت بڈھا مرتا بھی نہیں...... کم بخت بڈھا مرتا بھی نہیں۔'' نرسوں کی آواز جیسے کمرے میں ابھی





تک گونج رہی تھی۔

''تیرے ہاتھ میں نہیں... میرے ہاتھ میں تو ہے۔'' اکرام کو لگا جیسے پٹھان ڈرائیور کھیس نکالے اس پر ہنس رہا ہو۔ شاید مجھے ہذیان ہو رہا ہے، ورنہ یہ رشیدہ یہاں پانی کا گلاس لے کر کہاں سے آ گئی؟ ''تیرے ہاتھ میں نہیں... میرے ہاتھ میں تو ہے۔'' پٹھان ڈرائیور اسے چڑانے کو اس کی نقل اُتارے جا رہا تھا۔ نرسوں اور پٹھان کی آوازوں کا شور اتنا بڑھا کہ اکرام نے بائیں ہاتھ سے آکسیجن کی نالی ناک سے کھینچ کر نکال لی اور کروٹ بدل کر اپنے آپ کو بستر سے گرا لیا۔

☆☆☆☆☆

# دین کے محافظ

''میں دیکھ رہا ہوں کون ہے۔'' گھنٹی کی تیز آواز سنتے ہی شہزاد نے گویا باقی گھر والوں کو زحمت سے بچایا۔ چھ فٹ اونچا آہنی دروازہ، جس پر باہر سے قفل پڑا تھا اور رات کو اندر سے بھی قفل ڈال دیا جاتا تھا۔ دروازے کے اوپر باقاعدہ خاردار تار کے چھلّے بنا کر لگائے گئے تھے کہ کوئی اوپر چڑھ کر نہ آ سکے لیکن اب اندر سے یہ نظر نہیں آتا تھا کہ باہر کون ہے۔ شہزاد نے گیٹ کا چھوٹا پھاٹک کھولا اور باہر اپنے دوست خالد کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ''کتنی بار کہا ہے، پہلے پوچھ کر، پھر دروازہ کھولا کرو۔'' اندر سے ابا کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔

تقسیم کے وقت کراچی مچھیروں کی بستی، خوب صورت فوجی چھاؤنی اور بندرگاہ تھی۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجروں سے ایک شہر بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر آبادی میں ملک کے دوسرے شہروں کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ امن و امان کا گہوارہ سمندر کے کنارے، موسم معتدل۔ ایسے میں تجارت اور کاروبار خوب پھلا پھولا اور اردگرد کے دیہاتوں اور قصبوں سے خاصی تعداد میں لوگوں نے یہاں نقل مکانی کی۔ چورنگی پر لڑکیوں کا ایک بڑا کالج ہے۔ اسی کی بازو والی گلی میں شہزاد کے والد نے گھر بنایا تھا۔ انکم ٹیکس محکمے میں کلرک تھے۔ اوسط آمدنی والے لوگوں کا محلّہ تھا۔ کبھی پُرسکون اور جرائم سے دور ہوا کرتا تھا مگر پچھلے دس پندرہ سالوں سے فرقہ واریت، جرائم اور لاقانونیت نے لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔

''یار کہاں تھے... تم نے تو کل آنے کا وعدہ کیا تھا۔'' شہزاد نے خالد سے گلہ کیا۔ ''ابے اب تو آ گیا ہوں، تم سے تو یہ بھی نہ ہوا۔'' خالد نے شہزاد کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا۔

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر





خالد کو اشعار بے تحاشا یاد تھے اور استعمال کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ ''سرکار آپ حکم کریں۔'' شہزاد نے مسکرا کر کہا۔ خالد اپنی چودہ سالہ پرانی ٹیوٹا کرونا کی طرف بڑھا اور اس کی ڈگی کو کھول دیا۔ ''یار یہ کرکٹ کے سامان کا تھیلا اپنے پاس رکھ لو۔'' ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے شہزاد کو پاس بلایا اور تھیلے کی زپ کھول کر دکھایا۔ اوپر ہی دو گرے نکواس کے بلے اور پیڈز وغیرہ تھے۔ انھیں ہاتھ سے ایک طرف کر کے تھیلے کی تہ کو نیم وا کیا۔ شہزاد کو اس میں کلاشنکوف کی جھلک نظر آئی۔ وہ بوکھلا کے پیچھے ہٹ گیا۔ ''ابے مروائے گا کیا......'' شہزاد نے تھوک نگلا۔ ''یار اب میں تمھیں دھوکا تو دینے سے رہا۔ اس وقت حالات گرم ہیں اور مجھے یہ کہیں رکھوانی ہے۔'' شہزاد کا دماغ گویا اوور ٹائم میں کام کر رہا تھا کہ اس مشکل سے کیسے نکلے۔ ''یار ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن اگر ابا کو پتا چل گیا تو گھر سے نکال دیں گے۔'' اب خالد چِڑ سا گیا ''نہیں رکھ سکتے تو صاف کہو۔ ابا کو بتانے کی ضرورت کیا ہے؟ ظاہر ہے کرکٹ کا سامان ہے۔'' یہ کہہ کر دھڑ سے گاڑی کی ڈگی بند کر دی۔ ''ارے نہیں... نہیں۔'' شہزاد خالد کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈگی کھولی اور تھیلا اندر جا کر اپنے کمرے میں پلنگ کے نیچے رکھ آیا۔ خالد پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ شہزاد دوسری طرف بیٹھ گیا۔ ''چلو یار آغا کا جوس پینے چلتے ہیں۔'' شام ہوتے ہی پیدل، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں میں لوگ یوں اس کا رخ کرتے تھے گویا جوس مفت تقسیم ہو رہا ہو۔ علاقے کے نوجوان سگریٹ، پان اور جوس کے دوران ملک کے تمام سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل طے کر لیتے تھے۔

شہزاد سے دوستی یہیں آغا جوس ہاؤس پر ہوئی تھی۔ شہزاد بی کام سالِ دوئم میں تھا جب کہ خالد کا پچھلے دو سال سے اکنامکس کا آخری سال تھا۔ کوئی چھ مہینے پہلے شہزاد کا دس لڑکوں سے آغا جوس ہاؤس پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات بہت چھوٹی تھی کہ پہلے جوس کا آرڈر کس نے دیا۔ مگر آج کل لوگ گویا معاملات کو سلجھانے کے بجائے مرنے اور مارنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ شہزاد یوں تو اکیلا تھا مگر آس پاس محلے کے کئی شناسا چہرے دیکھ کر بالکل پیچھے نہ ہٹا۔ لیکن جب مخالف لڑکوں نے کھٹاک سے کمانی دار چاقو کھولا تو وہ شناسا چہرے اچانک غائب ہو گئے تو خالد نے نیفے میں اڑسے پستول کی جھلک دکھا کر جھگڑا منٹوں میں چکا دیا تھا۔ اسی دن سے دونوں کی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ خالد کے پاس گاڑی تھی اور پیسے بھی عموماً حاضر رہتے تھے۔ شہزاد پیدل بھی تھا اور پھوکٹ بھی، اسے یہ دوستی خوب راس آ رہی تھی۔

کوئی تین دن بعد خالد اور شہزاد کی دوبارہ ملاقات ہوئی، آج جمعہ تھا۔ کالج کی چھٹی۔ خالد

UrduDost.com

صبح ہی گاڑی لے کر آ گیا تھا اور دونوں دوست بے مقصد گھوم رہے تھے۔ ”سوچتا ہوں آج تمہیں کچھ اچھے دوستوں سے ملواؤں۔“ خالد نے کہا ”کون سے دوست؟“ ”یار تجھے تو پتا ہی ہے میں تیری طرح لا مذہب نہیں ہوں۔ تو تو بس نام کا مسلمان ہے۔ یہ چند ہم خیال لوگوں کا گروپ ہے جو مذہب کو دوسروں کی دست درازی سے بچاتا ہے۔“ ”کیسے بچاتا ہے؟ کیا تبلیغی جماعت کی بات کر رہے ہو“ اس نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ ”نہیں یار۔“

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

خالد کے جوابات ایسے ہی گول مول ہوتے تھے۔ ذہانت میں لاجواب تھا۔ کالج کے ریکارڈ کے برعکس اسکول میں اس کا شمار ہمیشہ ذہین ترین شاگردوں میں تھا۔ گیارہویں جماعت میں ایک نمائش میں کوریا کے اسٹال پر گیا۔ اس کے بعد وہ خود ساختہ کمیونسٹ ہو گیا۔ کم ہال سنگ کی جتنی کتابیں اسے ہر ہفتے ملتی تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ دنیا بھر کے معاشی مسائل اور ان کے کمیونسٹ حل اس نے سب پڑھ ڈالے۔ پھر ایک سال دل اُکتا گیا۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک پیر صاحب کی مریدی میں آ گیا۔ داڑھی بڑھا لی، ٹخنوں سے اونچی شلوار، گھر والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ یہ تصویریں اُتارو، موسیقی بند کرو، برقع اوڑھو۔ یہ بھوت اُترا تو ایک اور جماعت کے ہاتھ چڑھ گیا جس نے اسے مذہب کے ناموس بچانے کے لیے کلاشنکوف کی راہ پر لگا دیا۔ اب اس راستے پر اتنا آگے نکل آیا تھا کہ واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ ”یار تو پانچ وقت کی نماز تک تو پڑھتا نہیں یہ مذہب کو بچانے کا ٹھیکہ تجھے کیسے مل گیا۔“ شہزاد کی آواز خالد کو واپس حال میں کھینچ لائی۔ یار ان سطحی باتوں میں وقت ضائع نہ کیا کرو۔ مولانا صاحب نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ دلوں کا حال خدا جانتا ہے۔ حلیہ وہ رکھو کہ شبہے سے بچو۔“

خالد کی ٹیوٹا اب ناظم آباد کے شمال میں ایک نئی زیرِ تعمیر بستی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ پہاڑی کے دامن میں بسی ایک نئی آبادی تھی، جہاں ابھی تک زیادہ تر مکان خالی تھے یا زیرِ تعمیر تھے۔ جو چند مکان آباد تھے ان ہی میں سے ایک میں شہزاد خالد کے ساتھ داخل ہوا۔ دس بارہ لڑکے، زیادہ تر بیس سے پچیس سال کی عمر کے۔ بہ ظاہر بے ضرر عام سے چار ایک طرف بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ تین چار ٹی وی کے اطراف میں جمع تھے۔ اگر کچھ مختلف تھا تو کمرے میں دو اضافی ٹی وی جن پر اس گھر کے اطراف کا منظر تھا۔ دیوار کے ساتھ کچھ کلاشنکوفیں کھڑی تھیں۔



UrduDost Library

”میرا پرانا اور تم لوگوں کا نیا دوست شہزاد۔“ خالد نے گویا بہت سے فاصلے ایک ہی جست میں طے کرا دیے۔

تھوڑی سی دیر میں ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے ماحول کو سنجیدہ رنگ دے دیا۔ ”سب سے پہلے رپورٹ“ خالد تم بتاؤ۔ ”میں، جمال اور جاوید پرسوں سرخ رو ہوئے۔ نشان زدہ گھر میں ہم رات دس بجے کود گئے تھے۔ گھر میں دو مرد تھے اور تین لڑکے۔ ہم نے پانچوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ ایک عورت نے تو میرے پیر پکڑ لیے۔ مگر میں نے اس کو ایک ٹھوکر سے ہٹا دیا۔ دو چھ سات سال کے سنپولیے بچ نکلے بس اس کم بخت جمال کو پتا نہیں کیا تکلیف ہے، چھوٹوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ آیندہ میں اسے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔“ اللہ اکبر کا نعرہ گونج گیا۔ ادھیڑ عمر کا لیڈر شہزاد کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ شہزاد کو لگ رہا تھا ”مگر یہ لوگ بھی تو مسلمان ہیں۔“ اسے اپنی آواز کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ ”نام کے مسلمان...... کافروں سے زیادہ خطرناک ان کو رہنے دیا تو مذہب ختم ہو جائے گا۔ ان کو مارنا عین ثواب ہے، کبھی قرآن غور سے پڑھا ہے۔“ ادھیڑ عمر شخص نے کڑک کے جواب دے دیا۔ شہزاد گنگ تھا۔

واپسی پر شہزاد کا خالد سے جھگڑا ہوا۔ گھر آنے تک خالد نے اسے راضی کر لیا تھا کہ وہ صرف ”کھلے دل“ سے گروپ کے جلسوں میں شریک ہو اور اگر ان سے متفق نہ ہو تو سب بھول کر اپنی راہ لے۔ خالد نے اسے بتایا کہ اسے شہزاد کی ذہانت، بہادری اور دوستی پر کتنا فخر ہے اور سب دوستوں کی مخالفت کے باوجود اس نے شہزاد کو وہاں لے جا کر کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ تمھیں اسے ایک نوکری سمجھنا چاہیے۔ جس میں گاڑی بھی ملے گی اور تنخواہ بھی اور سب سے بڑی بات کہ عاقبت بھی سنورے گی۔

شہزاد کے گھر خالد کا آنا جانا بڑھ گیا۔ ہفتے میں تقریباً پانچ چھ بار خالد شہزاد کو لے کر شمالی ناظم آباد کی طرف جاتا۔ گھر والوں کی نظر میں شہزاد کمپیوٹر کورس کر رہا تھا۔ اگلے دو تین ماہ میں شہزاد کے ذہن میں شرافت اور نیک نیتی کے جالے بکھرتے چلے گئے۔ اسے آہستہ آہستہ یقین سا ہونے لگا کہ خالد اور اس کے دوست دین کی خدمت میں اپنی جان دینے کو تیار ہیں اور اسی لیے دوسروں کی جان لینے سے گریزاں نہیں ہیں۔ اس دوران شہزاد نے مونچھیں رکھ لی تھیں۔ چال میں پھرتی، گفت گو میں اعتماد اور مالی حالات میں بہتری آ چکی تھی۔ اس نے باپ اور بڑے بھائی سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ بھاوج اس کے دیے ہوئے تحفوں سے خوش تھیں۔ اماں کماؤ پوت کی دُلھن ڈھونڈ رہی تھیں۔

تقریباً چھ ماہ بعد شہزاد کو پہلی مرتبہ دین دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کا موقع ملا۔ شہزاد، خالد، سلامو اور قادر شام آٹھ بجے ایک گھر میں جا کودے۔ کمال اور رشید باہر گاڑی میں بیٹھے رہے۔ گھر کے مکین بندوق کی نالیوں کے آگے کانپ رہے تھے اور شہزاد جو باہر سے پُر اعتماد نظر آتا تھا، اندر سے خود بھی کانپ رہا تھا۔ کئی بار اسے لگا کہ وہ سب اُلٹ دے گا اور اس میں اس کی آنتیں تک باہر آ جائیں گی۔ مگر شہزاد ہی سب سے زیادہ چیخ رہا تھا۔

"تم لوگ دشمنِ دین ہو۔"

"مگر بھائی ہم تو مسلمان ہیں... کلمہ سن لو۔"

"مسلمان ہو تم، ان کی پوجا کرتے ہو۔" شہزاد نے دانت پیس کر دیوار پر لگی پانچوں ناموں کی تختی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ دونوں ہاتھ پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔ گولی شہزاد نے چلائی۔ لگتا تھا اس کی انگلی میں تشنج ہو گیا ہے۔ لبلبی دبتی ہی نہیں تھی۔ خالد نے اسے بھی ایک عدد گالی سے نوازا اور اپنی بندوق شہزاد کی طرف موڑ کر سلامو نے ہاتھ بڑھا کر شہزاد کی انگلی لبلبی پر دبا دی۔

اس "بسم اللہ" کے بعد تو گویا شہزاد کا ہاتھ کھل گیا۔ بربریت کا بازار تو پہلے ہی گرم تھا اور تنور ہو گیا۔ قاتلوں کے گروہ میں ایک اور دلاور کا اضافہ ہو گیا۔ اگلے چھ ماہ میں شہزاد نے آٹھ حملوں میں حصہ لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ تنظیم کے اخراجات کے لیے اِغوا اور گاڑیوں کی چوری میں بھی ہاتھ بٹایا۔ حالاں کہ اسے یقین تھا کہ کوئی اس کی وابستگی سے آگاہ نہیں لیکن کچھ لوگوں سے اس کے تعلقات میں ایک کھنچاؤ سا آ گیا تھا اور کچھ اپنے کام نکلوانے کے لیے اسے ڈھونڈنے لگے تھے۔

آج کی میٹنگ میں ایک "بڑے کام" کا پلان طے کیا گیا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک مسجد کو چاروں طرف سے گھیر کر شہزاد، خالد، سلامو اور قادر اور رشید مختلف دروازوں سے داخل ہو کر کلاشنکوف سے فائر کھول دیں گے۔ ایک ہی واردات میں امید تھی کہ پچاس کے قریب دشمنانِ دین سے زمین پاک ہو جائے گی۔ گزشتہ روز ڈیفنس سے ایک پجیرو جیپ بھی اِغوا کر لائے تھے۔ آج پیر کا دن تھا اور چار دن بعد جمعے کی نماز کے بعد کا پروگرام طے تھا۔ اپریل کا موسم تھا۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ ابھی تک بہت سے نمازی مسجد کے باہر تک صف بندی کر لیتے تھے جس سے ہدف لینے میں آسانی کا امکان تھا۔

شہزاد کے پاس اب اپنی گاڑی تھی۔ وہ خالد کو چھوڑ کے گھر چلا آیا۔ محلے میں کسی سے علیک





سلیک کا سوال ہی نہیں تھا۔ گاڑی بند کر کے گھر کے گیٹ پر پہنچا تو ایک نوجوان نے اس سے صدیقی صاحب کا پتا پوچھا۔ صدیقی صاحب دائیں والی گلی کے آخری مکان میں رہتے تھے۔ جتنی دیر میں شہزاد نے پتا سمجھایا۔ اسے پشت میں پستول کی نالی کی ٹھنڈی سختی محسوس ہوئی۔ اس کا ریوالور شہزاد کے پہلو میں تھا۔ "دروازہ کھلواؤ اور کوئی آواز نکالی تو مارے جاؤ گے۔" گھنٹی کی آواز پر شہزاد کی نگاہیں آہنی گیٹ کے پار ادھیڑ عمر باپ کو جائے نماز سے اُٹھ کر چپل گھسیٹتے آتا دیکھ رہی تھیں۔ "کون" کی آواز پر اس نے پھر سوچا کہ چیخے۔ ابا دروازہ مت کھولنا۔ لیکن پستول کے ٹھوکے پر اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

دروازہ کھلا اور شہزاد دھکے سے اوندھے منہ اندر باپ پر گرا۔ اس کے پیچھے چار داڑھی والے جوان صحن میں داخل ہو چکے تھے۔ دو کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ انہوں نے شہزاد، اس کے بڑے بھائی اور والد کو ایک کمرے میں جمع کیا، ماں اور بھاوج کو باورچی خانے میں۔ شہزاد کا خون کھول رہا تھا۔ کاش اس وقت میرے پاس میری کلاشنکوف ہوتی۔ جیسے اس کے خیالات پڑھ کے ایک نوجوان نے اس کے منہ پر بٹ مارا۔ ہاتھ پیچھے بندھواؤ۔ "بیٹا ہمارا قصور کیا ہے؟" شہزاد کے والد بار بار یہی سوال کرتے تھے۔ باورچی خانے کے اندر سے شہزاد کی ماں کی گھٹی گھٹی رونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

"بکواس بند کر بڈھے۔" آخر ایک نوجوان نے تنگ آ کر شہزاد کے والد کے سر پر زور کا ہاتھ مارا۔ "تم حرام زادوں کا قصور یہ ہے کہ تم سب دشمنِ ایمان ہو اور جب تک تم لوگ زندہ ہو دین کو تم سے خطرہ رہے گا۔"

"نہیں بیٹا تم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ... مجھ سے کلمہ سن لو۔ ہم بھی اسی ایک اللہ اور محمدؐ کے ماننے والے ہیں۔" شہزاد کے والد کو یقین تھا کہ اس کے بعد ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔

"چپ منافق۔ لے بڈھے! سب سے پہلے تو ہی چل۔" گو شہزاد کو اپنے سینے میں گرم سیسہ گھستا محسوس ہوا لیکن اس کی بجھتی آنکھوں میں آخری منظر اس کے باپ کی کنپٹی تھی جس میں داہنی جانب ایک روزن تیسری آنکھ کی طرح اس کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

UrduDost.com

# بغاوت

دوشنبے کی صبح اللہ میاں کے دربار کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ یوں تو رحمت کا لنگر ہفتے کے ساتوں دن جاری رہتا ہے مگر دوشنبے کے روز فرشتوں کو خاص فرائض سونپے جاتے ہیں۔ سب فرشتے دوشنبے کے منتظر رہتے ہیں کہ دیکھیے اب یزداں کیا نیا گل کھلاتا ہے۔ آج بھی دوشنبہ ہے۔ مکاں سے لامکاں تک نیلی چادر تنی ہے جس کو جابہ جا ستاروں کی کاشی کاری سے سجایا گیا ہے۔ ہر طرف نور کی چاندنی بکھری ہے۔ دورویہ فرشتے دست بستہ، باریش، ہاتھ باندھے حکمِ الٰہی کے منتظر ہیں۔ دربار کا ابتدائی وقت مملکت کے روزمرہ کے معاملات نبٹانے میں صرف ہوا۔ پھر خدا کی رحمت سے حکم نازل ہوا:

''جاؤ اور پاکستان جا کر ہمارے سب سے زیادہ ضرورت مند بندے کی سب سے ضروری خواہش پوری کرو۔''

نوجوان، ناتجربہ کار فرشتے حیران تھے۔ آپس میں کھسر پھسر شروع ہوگئی کہ کیسے طے کریں گے کہ کس انسان کی ضرورت سب سے اہم ہے۔ سابقہ تجربوں سے انھیں یاد تھا کہ انسانی ضروریات لامحدود ہیں۔ لباس، خوراک، سر چھپانے کی جگہ جسے وہ گھر کہتے ہیں، صحت، تعلیم، ایک طویل فہرست ہے کہ جو ختم ہونے کو نہیں آتی اور پھر ضرورت کی نوعیت بھی فرداً فرداً بدلتی رہتی ہے۔ کسی کو سر چھپانے کے لیے ایک چھپّر کی خواہش، تو کوئی نصف میدان کو بھی ناکافی پاتا ہے اور پھر مادی ضروریات پوری ہو بھی جائیں تو غیر مادّی ضروریات کی اتنی ہی طویل فہرست ہے۔ غم،



UrduDost Library

خوشی، شادی، ملاپ، جدائی، تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ بنی نوع انساں کی مٹی سے نہیں ضروریات کے خمیر سے تعمیر ہوئی تھی۔ مگر دربارِ الٰہی میں دم مارنے کی کس کو جرأت۔ زیادہ تجربہ کار فرشتے زیرِ لب مسکرا رہے تھے، گویا کھیلِ یزداں سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ فرشتۂ اعظم نے کھنکھار کر گویا سرگوشیوں کا دم گھونٹ دیا۔ دربار برخاست ہوا۔ فرشتۂ اعظم نے یہ کام ایک بوڑھے تجربہ کار اور ایک نسبتاً نوجوان فرشتے کو سونپا۔

''خبردار... ناکام نہ ہونا اور یاد رہے سب سے ضرورت مند کی سب سے اہم ضرورت۔''

دونوں فرشتوں نے پر پھیلائے اور فرض کی بجا آوری کے لیے رختِ سفر باندھا۔ قطب شمالی سے دائیں گھومے، ہمالیہ کے اوپر سے چھلانگ کر کرۂ ارض کے اس حصے پر پہنچے جہاں پاکستان ہونا چاہیے تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک سیاہ دھند چھائی ہوئی ہے۔ پاکستان نظر نہیں آ رہا۔ GPS (Global Positianing Satellite خلا میں موجود مصنوعی سیارے جن سے زمین پر نقشوں اور جغرافیہ بندی کا کام لیا جاتا ہے) پر نکتہ ہائے منطقہ دیکھے، بالکل صحیح جگہ پر تھے۔ اسی تذبذب میں تھے کہ غیب سے ندا آئی۔

''یہ محض دکھاوے کی سیاہ چادر ہے جس میں پورا ملک چھپ گیا ہے۔ دیکھنے میں متاثر کن ہے لیکن اس کھوکھلی چادر میں جھانک کر دیکھو پاکستان نظر آ جائے گا۔''

فرشتوں کو سوچنے کی عادت اور اجازت نہیں تھی۔ بلاجھجک چادر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کو عبور کر کے نیچے دیکھا تو واقعی ایک بہت بڑے رقبے پر پاکستان پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کھیت لہلہا رہے تھے تو کہیں بنجر صحرا تھے۔ جابہ جا فخر سے سر اونچا کیے پہاڑ ایستادہ تھے۔ انھیں کے درمیان بہتے دریا اپنی منہ زوری میں آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے۔ ایسی خوب صورتی اور شوکت سے دونوں فرشتے مسحور رہ گئے۔

''ضرورت مند بستیوں کی نشانی یہ ہے کہ ان پر ایک سفید بادل چھایا ہوا ہوگا۔'' دونوں کے کانوں میں گویا بیک وقت فرشتۂ اعظم کی آواز گونجی۔

''سفید بادل جتنا زیادہ دبیز ہوگا، بستی اتنی ہی ضرورت مند۔''

دونوں نے نگاہ دوڑائی تو پورے ملک پر سفید بادلوں کے تین ٹکڑے نظر آئے۔ چھوٹا بادل بہ مشکل پانچ فی صد خطے پر پھیلا ہوا تھا۔ درمیانہ تقریباً پندرہ فی صد حصے پر اور ملک کے باقی اسّی فی صد رقبے پر ایک وسیع و عریض سفید بادل چھایا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تینوں بادلوں کی

UrduDost.com

کثافت ایک ہی جیسی تھی۔

''تین مختلف بادل اور تینوں کی کثافت ایک ہی جیسی؟'' اس سے پہلے کہ یہ سوال فرشتوں کے ذہن میں اُبھرتا، ان کے دماغ میں جواب گونج رہا تھا۔

''سب سے چھوٹا بادل پاکستان کے امیر طبقے پر سایہ دار ہے، درمیانہ بادل مڈل کلاس پر تنا ہے اور بڑا بادل غریبوں کی خواہشوں سے لبریز ہے۔''

''مگر تینوں کی کثافت ایک ہی جتنی کیوں ہے۔ چھوٹا بادل تو کم کثیف ہونا چاہیے؟''

''نادان فرشتو!، خواہشوں اور ضرورتوں کی اقسام مختلف ہیں مگر خواہشات کا انبار اور بوجھ ایک ہی جتنا ہے۔'' فرشتۂ اعظم مسلسل ان کی راہ نمائی کر رہا تھا۔

دونوں فرشتوں نے آپس میں طے کیا کہ سب سے بڑے بادل کے نیچے آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے، لہٰذا یہاں سب سے زیادہ ضرورت مند کا ملنا ممکن ہے۔ خواہشات کے دبیز بادل کو چیر کر فرشتوں نے بستی پر پرواز شروع کی۔ ہر طرف ماچس کی ڈبیوں جتنے بے ترتیب گھر بکھرے تھے۔ لگتا تھا جس کو جہاں جگہ ملی...اس نے ٹھکانا بنالیا۔ حالاں کہ شام ابھی ڈھلنا شروع ہوئی تھی لیکن چند ہی چھتیں ایسی تھیں جن سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ زیادہ تر چولھے ٹھنڈے تھے۔ مکینوں کی قسمت کی طرح۔ ایک جگہ لالٹین کی ٹمٹماہٹ نے فرشتوں کو متوجہ کیا۔

اس جھگی میں ایک ماں اپنے تین چھوٹے معصوموں کو جھوٹی تسلیوں کی غذا کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ عورت سب سے چھوٹے بادل تلے ایک گھر میں کھانا پکانے پر مامور ہے۔ پچھلے ماہ کی تنخواہ ختم ہوچکی تھی اور نئی تنخواہ آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ یہ بھوکا خاندان اب دن میں ایک وقت کھانے پر گزارا کر رہا تھا۔ مگر یہ معاشی تقسیم بچوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بھوک سے بلک رہے تھے۔ ماں پچکارتی تھی، پھر خود بھی رونے لگی۔ فرشتوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمجھے یہ سب سے ضرورت مند ہوگی۔ اس کی خواہش دریافت کرنا چاہتے ہی تھے کہ برابر والی کھولی سے رونے کی آواز آئی۔ اس کی طرف لپکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک باپ اپنے جوان بیٹے کا سر گود میں رکھے گریہ کر رہا ہے۔ ایک بیٹا پہلے گٹر میں گر کر مر چکا تھا۔ ایک کو نشے کی ایسی لت پڑی کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ زندہ ہے یا مر چکا ہے اور گھٹ رہا ہے۔ اب یہ آخری چشم و چراغ تپ دق کے آخری مراحل میں تھا، دواؤں کا خرچہ بوڑھے باپ کے بس سے باہر تھا۔ فرشتوں کے دل جیسے رک سے گئے۔ واقعی کتنا ضروری ہے کہ اس بوڑھے کے آخری سہارے کو بچالیا جائے۔ اس سے



UrduDost Library

پہلے کہ بوڑھے کی خواہش دریافت کرتے، غیب سے حکم ہوا کہ پچھلی گلی کے نکڑ پر جو جھونپڑی ہے وہاں پہنچو۔ یہاں بھی ایک عجیب منظر تھا۔ ایک جوان لڑکی، دُلھن کی طرح سجی بنی، گلی میں رسی بندھی چھت سے لٹک رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ جہیز کم ہونے کی وجہ سے بارات واپس ہوگئی اور اس نیک بخت نے اپنی مشکلات سے نجات کا یہ راستہ ڈھونڈا تھا۔ اب دونوں فرشتے پریشان ہو چکے تھے کہ یا الٰہی اس درجہ کی ضروریات اور مشکلات کے باوجود یہ انسان زندہ ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں اور اپنی نسل بڑھانے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشکل یہ تھی کہ ایسا نہ ہو کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیں جب کہ اس سے بڑھ کے ضرورت مند موجود ہو۔

دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں جیسے کچھ فیصلہ کیا اور پاکستان کے وسطی چوک میں پہنچ گئے۔

''ہم خداوند قدوس کے ہرکارے ہیں۔'' دونوں فرشتوں میں جو زیادہ بڑی عمر کا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں کا ایک بھونپو بنا کے اعلان کیا۔

''ہمیں حکم ہے کہ ملک کے سب سے زیادہ ضرورت مند شخص کی سب سے اہم ضرورت کو پورا کریں۔ ہم عاجز ہیں اور یہ طے نہیں کر سکتے کہ سب سے زیادہ ضرورت مند کون ہے۔ کل صبح دس بجے سب ضرورت مند یہاں وسطی چوک پر پہنچ جائیں اور آپس میں طے کر کے سب سے زیادہ ضرورت مند شخص کی نشان دہی کریں۔''

دونوں فرشتے یہ اعلان کر کے بادلوں سے اوپر اُٹھ گئے۔ دوسری صبح کا سورج ہر شخص کے لیے امید کا نیا پیغام لایا۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ہے اور آج اس کا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔ دس بجے سے پہلے ہی چوک کا کونا کونا بھر چکا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، پیدل، اونٹ گاڑیوں، بیل گاڑیوں، سائیکلوں، رکشا، کار غرض دور دراز سے ملک کے کونے کونے سے لوگ آ کر جمع ہو چکے تھے۔ مضمحل چہرے، مضطرب چہرے، پُرامید چہرے، ان ہی کے درمیان کہیں کہیں کچھ مطمئن اور پُرسکون چہرے بھی نظر آتے تھے مگر یہ خال خال ہی تھے۔ آٹے میں نمک سے ذرا کم۔ اس قدر مجمعے کی وجہ سے ماحول پسینے کی بو سے مہک رہا تھا۔ آج چھوٹے بادل تلے کے مکین بھی جیسے اس بو سے غافل تھے۔ وعدے کے مطابق ٹھیک دس بجے دونوں فرشتے اپنے پر پھڑ پھڑاتے چوک کے وسط میں ایستادہ فوارے پر آ موجود ہوئے۔

''سب لوگ اپنی اپنی ضروریات بیان کریں پھر آپ لوگ آپس میں طے کر کے بتائیں کہ

سب سے زیادہ ضرورت مند کون ہے۔'' عمر رسیدہ فرشتے نے ہدایت کی۔

اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی جیسے آوازوں کا ایک طوفان آ گیا۔ ہر شخص اپنی پوری آواز سے اپنی خواہش بیان کر رہا تھا۔ دونوں فرشتوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں مگر ان سے لاتعلق اب لوگ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میری کار اتنی پرانی ہے کہ اب محلے کے لڑکوں نے دھکا لگانے سے انکار کر دیا ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر ٹیچر کی آواز آئی۔

''اس قیامت کی گرمی ہے کہ پنکھوں سے بھی لو نکلتی ہے۔ مجھے تو صرف ایک ایئر کنڈیشنر درکار ہے۔'' ایک درمیانی عمر کی خاتون نے احتجاج کیا۔ گرمی اور پسینے سے ان کا دھوپ کا چشمہ ناک کی پھننگ پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''لعنت ہے تم لالچیوں پر، بارش میں میری جھگی ایسی برستی ہے جیسے کوئی چھلنی سے پانی روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے تو صرف ایک ایسی سر چھپانے کی جگہ چاہیے جس کی چھت پکی ہوئی ہو۔'' ایک اور آواز اُبھری۔

غرض کہ چوک قسم قسم کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ایسے میں ایک چالاک نوجوان نے اپنی ضرورت تو بیان کی ہی، ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے برابر کھڑے لوگوں کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے جب وسائل محدود ہوں تو مسائل کم ہونا بہتر ہے۔ اس نوجوان کی اس حرکت کو دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی دہرایا۔ ایک صاحب نے جن کے منہ پر نوجوان نے ہاتھ رکھا تھا، اپنی کہنی اس نوجوان کے پیٹ میں ماری۔ بس پھر کیا تھا، چوک اور اس کے آس پاس کا حصہ ایک عظیم دنگل میں بدل گیا، لوگ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑے دے رہے تھے۔ کم زور، بچے، بوڑھے، بیمار، عورتیں خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ ضروریات کے حصول میں اکثر طاقت ور اور زور آور بازی لے جاتے ہیں۔ فرشتوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''سنیے سنیے بند کیجیے یہ مار پیٹ، بند کریں اس دنگل کو۔'' بوڑھے فرشتے نے بار بار ہدایت کی مگر ماحول کی گرمی میں کچھ فرق نہیں پڑا۔

''مار پیٹ بند کریں ورنہ ہم چلے جائیں گے۔ ضرورت پوری کیے بغیر۔'' نوجوان فرشتے نے پہل کی۔ بوڑھے فرشتے نے اسے لرز کر دیکھا۔ ایسا کرنا حکمِ خداوندی کی نافرمانی ہوتی اور شیطان کا انجام اتنا پرانا نہیں تھا کہ بوڑھے فرشتے کو یاد نہیں ہوتا، نوجوان فرشتے نے آنکھ ماری تو اس کے





ساتھی فرشتے نے سکون کا سانس لیا۔ بہرحال یہ اعلان کارگر ثابت ہوا اور مار پیٹ بند ہو گئی۔

''یہ طریقہ صحیح نہیں تھا۔ آپ سے درخواست ہے کہ کل صبح پھر اسی جگہ جمع ہوں اور اس دفعہ میں آپ کے امیر سے درخواست کروں گا کہ وہ سب سے زیادہ ضرورت مند شخص کی نشان دہی کرے۔'' بوڑھے فرشتے کے اعلان پر لوگوں میں چہ می گوئیاں پیدا ہو گئیں۔

مگر فرشتوں نے اپنے پر پھیلائے اور بادلوں کے اوپر کہیں غائب ہو گئے۔

دوسرے دن فرشتے چوک پر پہنچے تو آج چوک بہت صاف نظر آیا۔ اطراف میں چونے سے حد بندی کر دی گئی تھی۔ چوک پر دو اونچی کرسیاں بھی فرشتوں کے لیے فراہم تھیں۔ آج مجمع کل سے ذرا کم تھا۔ مگر بہت سے لوگ کل ہی سے جمع تھے۔ بہت سے لوگوں نے رومال اور چادریں رکھ کے اپنے قرابت داروں کے لیے جگہ بنا رکھی تھی۔ امید اور امکان کے فسوں نے ماحول کو نسبتاً پُرامن اور پُرسکون رکھا۔

ٹھیک دس بجے فرشتوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ ان کی دعوت پر علاقے کا امیر آگے بڑھا اور ان کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں لہرائے اور ایک دو زندہ باد... مردہ باد کے نعرے بھی لگوا دیے۔ اس نے دونوں فرشتوں کی تعریف اور توصیف کی۔ ان کی آمد کو خوش آئند قرار دیا اور انھیں اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی رو میں مزید بہتا، بزرگ فرشتے نے اسے ٹوکا اور دریافت کیا کہ اپنی رعایا کے سب سے ضرورت مند فرد کی نشان دہی کرے۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ امیر ہونے کے ناتے مجھے اپنی خواہشات کا گلہ گھونٹنا پڑتا ہے۔ مجھ سے زیادہ ضرورت مند کون ہوگا اور یہ ضرورت میری ذاتی نہیں بلکہ رعایا کے مفاد میں ہے۔ اگر میں مزید چار سال کے لیے امیر نامزد ہو جاؤں تو رعایا کی بھلائی کے لیے اسی طرح کام کرتا رہوں گا۔'' امیر اپنی دھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ اس اشتعال سے غافل جو اس کی باتوں سے لوگوں میں پیدا ہو رہا تھا۔

''جھوٹا ہے، پاپی ہے، بکواس کر رہا ہے۔ یہ ہمیں مزید لوٹے گا۔'' تمام لوگ گویا سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ معاملہ ہاتھ سے نکلتا... بوڑھے فرشتے نے امیر کی بات کاٹی۔

''یہ طریقہ بھی ناکام رہا۔ وہ مایوسی سے اپنا سر ہلا رہا تھا۔ ہم آج پھر واپس جا رہے ہیں۔ کل صبح دس بجے پھر آئیں گے۔ بہتر ہے آپ اپنے ملک کے عظیم دانش ور اور مفکّر سے مدد لیں یا تو وہ

فیصلہ کرے کہ سب سے زیادہ ضرورت مند کون ہے یا پھر آپ سب مل کر ایک ایسی خواہش چن لیں جو سب کی مشترک ہو یا کم از کم اکثریت کی خواہش ہو کیوں کہ اس خواہش کے چننے میں ہر شخص کا دخل ہوگا۔ اس طرح ہم انصاف برت سکیں گے اور حکمِ الٰہی بجا لائیں گے لیکن واضح رہے کل ہمارا آخری دن ہے۔'' یہ کہہ کر دونوں فرشتے پھر اُڑ کر آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔

دوسرے دن صبح خاصا کم مجمع تھا۔

''کیا اب لوگ ضرورت مند نہیں رہے؟'' نوجوان فرشتے نے دریافت کیا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اکثر ضروریات وقتی ہوتی ہیں۔ ضرورت پوری نہیں ہوتی تو بھی وقت آگے نکل جاتا ہے۔ لوگ اس کے اثرات چنتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایک ضرورت پوری ہونے سے خود نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں لوگ ہم سے مایوس ہو رہے ہیں اس لیے اب مجمع کم ہے۔'' بوڑھا فرشتہ متفکر تھا۔

چوک کے وسط میں شہر کا عقل مند ترین شخص موجود تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا اعتماد، آنکھوں میں چمک تھی۔ فرشتوں کی امید کے برخلاف وہ بوڑھا تو ہرگز نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ ادھیڑ عمر رہا ہوگا۔ کلین شیو، نیلی قمیض اور کالی پتلون۔ کپڑے صاف اور استری شدہ، گو زیادہ مہنگے نہیں لگتے تھے۔

''میں آپ کی آمد کا مشکور ہوں۔'' بوڑھے فرشتے نے دانا کا شکریہ ادا کیا۔ ''امید ہے آپ سب سے زیادہ ضرورت مند کی نشان دہی کر سکیں گے۔''

''ہم سب ضرورت مند ہیں۔ کوئی زیادہ اور کوئی کم نہیں۔'' دانا نے سکون سے جواب دیا۔

''مگر ہمیں حکم ہے کہ سب سے زیادہ ضرورت مند کی سب سے اہم ضرورت کو پورا کریں۔'' نوجوان فرشتے نے لقمہ دیا۔

''آپ دونوں مجھے اشترا کی نمائندے لگتے ہیں جو ہم میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' دانا کے لہجے میں برہمی تھی۔

''بس زیادہ حدِ ادب۔ گستاخی کی سزا معلوم ہے؟'' بوڑھے فرشتے کی آواز میں طاقت کی گونج تھی۔

''ہمیں لڑاتے ہو اور پھر دھمکاتے ہو۔ مارو انھیں۔'' دانا کی آواز میں حقارت تھی، ''یا تو ہم سب کی ایک ایک خواہش پوری کرو یا یہاں سے غائب ہو جاؤ۔''





''ہاں سب کی ایک ایک خواہش پوری کرو، سب کی خواہش پوری کرو۔'' مجمع اب طوطے کی طرح دانا کی بات دہرا رہا تھا۔ مجمعے کا اشتعال بڑھتا دیکھ کر بوڑھے فرشتے نے ہاتھ اُٹھایا مگر اب کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔

''دیکھیے ہمیں آپ کے مالک نے بھیجا ہے۔ اس نادانی کی آپ کو اور ہم کو دونوں کو سزا ملے گی۔'' بوڑھے فرشتے کی آواز میں خوف اور لرزش تھی۔

مجمع اب بگڑ چکا تھا۔ اب منچلے نے پتھر اُٹھا کر ان کی طرف پھینکا۔ بس پھر کیا تھا، یہ گویا اشارہ تھا باقی مجمع کے لیے۔ اب سب نے جوتے، چپل، پتھر، غرض جس کے ہاتھ میں جو تھا فرشتوں کی طرف اُچھال دیا۔ فرشتوں نے حقارت سے مجمع کو دیکھا اور پر پھیلا کر آسمان کی راہ لی۔

☆☆☆☆☆

# بند گلی

حیدرآباد کی لال بتی کسی دوسرے شہر کی لال بتی سے ذرا مختلف نہیں۔ سرخ اینٹوں کی چار دیواری، درمیان میں زنگ آلود سلاخوں کا پھاٹک، جس کا ایک کھڑکی نما در کھلتا ہے اور دوسرے بڑے دروازے کا قبضہ ایک سرمئی شلوار قمیض والے چوکی دار کے قبضے میں ہے، جو ایک اسٹول پر براجمان مٹھی بند کر کے بڑا دروازہ کھول دیتا ہے۔ پھاٹک کے باہر مریضوں کے لواحقین جمع ہیں۔ کچھ فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے ہیں، کچھ دائیں ہاتھ پر چائے کے ٹھیلے کے گرد جمع ہیں۔ پھاٹک کے باہر بھانت بھانت کی آوازیں ہیں مگر اندر داخل ہوتے ہی ایک بیمار سناٹا ہے، جیسے پھاٹک نہ ہوا بیماری اور تن درستی کے درمیان ایک حدِ فاصل کھنچی ہو۔ باہر چائے والے کے اسٹال کے ساتھ پولیس کی ایک وین بھی کھڑی ہے۔ بیشتر پولیس والے کرسیوں پر براجمان بلاوجہ چائے پیے جا رہے ہیں۔ مفت کی چائے کا مزہ خریدی گئی، چائے سے کہیں بہتر ہوتا ہے اور ٹھیلے والا بے چارا مفت چائے کو کم تر نوعیت کی سزا سمجھ کر پلائے جا رہا ہے۔ پھاٹک کے بائیں کنارے پر ایک گنے کا رس نکالنے کی مشین ہے۔ مشین کا مالک گاہے بہ گاہے اپنے ہاتھ کی پشت سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتا جاتا ہے۔ پسینے کے جو قطرے رس میں گھل مل جاتے ہیں، گاہک اور تماش بین، سب اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بیشتر گاہک پیلے اور زرد دیدے لیے مکھیوں کے غول سے نبرد آزما ہیں۔ ایسے میں کسی کی نظر اس فقیرنی پر نہیں پڑی جو تقریباً گھسٹتی ہوئی پھاٹک تک جا پہنچی تھی۔ پیٹ اتنا پھولا ہوا تھا کہ مانو اب پھٹ ہی پڑے گا۔ تھکن سے نڈھال پھاٹک کے اندر تو جا گھسی مگر بھد سے زمین پر بیٹھ گئی۔ سر کی اوڑھنی کو پیٹ پر ایسے پھیلا لیا تھا جیسے اس مٹکے کو سب سے چھپا لے گی۔ کوئی





بھی جہاں دیدہ اس کے چہرے پر بکھرے درد کو آسانی سے پہچان سکتا تھا مگر اس حال میں بھی اس کے چہرے پر وہی مسکین مسکراہٹ سجی تھی جو فقیرنیوں کے چہرے کا مستقل حصہ بن جاتی ہیں۔

’ہٹ مائی کہاں گھسی آتی ہے؟‘ چوکی دار نے آواز لگائی۔

آواز پر رجسٹریشن کلرک نے سر اُٹھا کے دیکھا اور فوراً سمجھ گیا کہ یہ اب نہیں تو کبھی نہیں والا کیس ہے۔

’’سسٹر اس ماسی کو سنبھالو۔‘‘ کلرک نے آواز لگائی۔

سسٹر اور ایک وارڈ بوائے ٹھیلا لے کر لپکے۔ ’’ارے یہ کم بخت تو پورے دنوں سے ہے، اسے فوراً زچگی کے کمرے میں لے جاؤ۔‘ فقیرنی کو کونے والے کمرے میں اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ ہاتھ میں ڈرپ لگ گئی۔ نرس نے لپک کر ڈاکٹر عالم کو خبر کی۔ ڈاکٹر عالم نے جیسے تیسے ایک تیرہ سالہ لڑکے کے ہاتھ پر لگے گھاؤ کے ٹانکے ختم کیے اور فقیرنی کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ زچگی کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ جن حاملہ مریضوں کے لواحقین ہوتے، وہ مرد ڈاکٹروں کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیتے۔ ایسے میں کوئی لاوارث حاملہ عورت آ جائے تو ہی ڈاکٹری چل سکتی تھی۔ ڈاکٹر عالم نے اپنی اس نئی مریضہ کا سرسری سا معائنہ کیا۔

’’اچھے موقعے پر آ گئی۔ بس اب کچھ ہی دیر کی بات ہے۔‘‘ ڈاکٹر نے نرس سے سوالیہ انداز میں مشورہ کیا۔ ان کی نرس سینکڑوں کیس نبٹا چکی تھی جب کہ ذاتی طور پر ان کا یہ زچگی کا دوسرا کیس تھا۔ نرس نے اثبات میں سر کو ہلا کر گویا تشخیص کی تائید کی۔ مریضہ کی کراہیں جاری تھیں۔ وہ اسے چھوڑ کر دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے کہ اتنی دیر میں دوسرے مریض دیکھ لوں۔ آدھے گھنٹے بعد واپس آئے تو معاملہ وہیں کا وہیں تھا۔ پھر سے معائنہ ہوا۔ اس دفعہ مریضہ کے پیٹ پر سے کپڑا ہٹا کر اِدھر اُدھر سے دبایا۔ بہت بڑا اسٹیتھو اسکوپ رکھ کر بچے کی دل کی دھڑکنوں کو سنا۔ نرس کو ایک نئی ڈرپ لگانے کا حکم دیا۔ اب ان کا اعتماد ذرا متزلزل تھا۔ آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا مگر معاملہ وہیں اٹکا رہا۔ مریضہ کا حال پہلے سے زیادہ دگرگوں تھا۔ اب ڈاکٹر عالم کے ماتھے پر ہلکا سا پسینہ بھی نظر آنے لگا۔ نرس نے بھی حیرانی کا اظہار کیا۔ اس کے تجربے کے مطابق بھی معاملہ اب تک نپٹ جانا چاہیے تھا۔

فقیرنی کے چہرے پر موجود وہ دائمی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ تکلیف کی شدت چہرے سے عیاں تھی۔ اب ڈاکٹر عالم نے اپنی رجسٹرار ڈاکٹر صائمہ کو فون کر کے ان سے مشورہ کیا۔ صائمہ

امراضِ زچگی اور دیگر زنانہ امور کی ماہر تھی۔ ان کا سات سالہ تجربہ تھا۔ ڈاکٹر عالم نے احتیاطاً انہیں فون کرنے سے پہلے ایک بار پھر جا کر فقیرنی کا معائنہ کیا۔ اس دفعہ دونوں ہاتھوں سے اس کے پیٹ کو گود گود کے دیکھا۔ اِدھر اُدھر ہلایا اور سینے پر بھی آلہ لگا کر سنا مگر پھر کندھے اُچکا کر ڈاکٹر صائمہ کو فون کرنے چل دیے۔

''پیٹ کو انھوں نے اس زور سے اِدھر اُدھر ہلایا کہ میری تو دنیا میں بھونچال آ گیا۔ ایسا لگا گویا اس پُرسکون سمندر میں اچانک بغیر اطلاع طوفان آ جائے۔ آپ خود ہی انصاف کریں یہ ایک چھوٹی سی مشک نما کھولی جس میں گزشتہ دس ماہ سے میں زندہ ہوں، اتنی تنگ کہ پیر پھیلانے کو جگہ نہیں۔ سر ہلاؤں تو ماں کی پسلی سے ٹکرا جائے، کروٹ تو مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ہی مل سکتی ہے۔ ایسے میں وہ ڈاکٹر انگلیاں گاڑ گاڑ کر معائنہ کر رہا تھا۔ اور میں کبھی دائیں بچتا تھا، کبھی بائیں۔ اصل میں اب میرے باہر آنے کا وقت تو ہو چکا تھا لیکن میں ابھی باہر آنے کو تیار نہیں ہوں۔ گو ابھی بینائی تو نہیں آئی لیکن سماعت نے ہی ایک ایسی دنیا سے روشناس کرا دیا ہے کہ میں اس کھولی کو کہیں زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں۔ کل رات کے واقعے کے بعد تو فی الحال باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کل رات کا واقعہ بھی آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا لیکن پہلے ذرا شروع سے معاملہ بیان کر دوں تا کہ آپ خود انصاف کر سکیں۔''

''یہی کوئی دس ماہ پہلے سردیوں کی شام تھی جب فقیرنی ہوٹل تاج محل کی پچھلی گلی کا بار بار چکر لگاتی تھی۔ ہوٹل کے باورچی خانے کا دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا اور عموماً رات ایک بجے کے قریب کوڑا باہر آ جاتا۔ کوڑے کی خوشبو سے گویا آس پاس چھپے ایک نادیدہ بستی کے کئی بھوکے باسی اچانک نمودار ہو جاتے اور کسی کے ہاتھ روٹی کا ٹکڑا آتا تو کسی کو بوٹی مل جاتی۔ آم کی گٹھلی، تربوز کے ٹکڑے، خوبانی، میٹھا کیا کچھ نہیں تھا امکان میں۔ لیکن آج کوڑا نکلنے میں دیر ہو گئی تھی اور فقیرنی بھوک پیاس سے آس پاس ہی منڈلا رہی تھی۔

''ارے کہاں جاتی ہے کم بخت!'' ایک گشت پر مامور سپاہی نے للکارا۔ ''تیری وجہ سے چوریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔'' یہ کہہ کر سپاہی نے فقیرنی کی کلائی تھام لی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی حریصانہ چمک اور بڑھ گئی تھی۔ چھین جھپٹ کے مسائل اور مکر و دغا کے باقی مراحل ایک کوڑے کے ڈرم کے پیچھے طے ہوئے۔ یوں میرا وجود ٹھہرا۔ اس عمل قانونی سے گویا وہ علاقہ زیادہ محفوظ ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد کئی ماہ تک فقیرنی کی زندگی نسبتاً سکون سے گزری۔ کوڑے کے ڈھیر





سے اسے سب سے پہلے چننے کی اجازت ہوتی۔ پھر کوئی اور سپاہی اسے ''حرام زادی'' کہہ کر للکارتا۔

شاید یہ ہی اس کا نام تھا، اس لیے کہ سب سے زیادہ اس کے لیے یہی نام سنا گیا ہے۔ لوگ کچھ ایسے دانت کچکچا کے حرام زادی پکارتے کہ بے چاری ڈر کر اپنا تن من سب لٹانے پر تیار ہو جائے۔ کچھ ایسے پیار سے نام کو چاشنی کی مانند دہراتے کہ سن کر پیار آ جائے اور جی چاہے کہ پھر پکارو! کچھ ایسے کہیں گے جیسے برسوں کے بھوکے پیٹ میں کچھ پڑنے کے بعد ڈکار آ جائے۔ بہر حال مجھے تو یہ نام پسند آیا۔ گویا حرام زادی نہیں شاہ زادی کہہ رہے ہوں، جو سب کی ضرورت پوری کر رہی ہو۔ پچھلے دس ماہ اس نے ایک ایسی دنیا سے روشناس کرا دیا ہے کہ مجھے اپنی یہ تاریک، سیلی اور بودار پناہ گاہ ہی بہتر محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ہر بچے کے ساتھ خدا امید کی کرن بھیجتا ہے اور یہ پیغام بھی کہ وہ ابھی مایوس نہیں۔ مگر وہ تو بس ایسے ہی عادتاً یا شغلاً بچے بنائے جا رہا ہے جیسے کسی سے وعدہ کر بیٹھا ہو اور اب وعدہ خلافی اس کی شان کے خلاف ہے۔ ورنہ مایوس تو کیا وہ تو کبھی کا دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور دنیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

گزشتہ رات تو حد ہی ہو گئی۔ کل رات بھی ہوٹل کی دعوت دیر سے شروع ہوئی تو کوڑے کے ڈرم کی ضیافت میں بھی دیر ہوئی۔ ماں بھوک سے بلبلاتی آس پاس منڈلا رہی تھی۔ میری موجودگی نے اس کی بھوک اور کھول دی تھی۔ رات کوئی دو بجے کوڑے کے ڈرم باہر آئے تو کئی بھوکے ننگے، لعنت کے مارے وجود اس پر ٹوٹ پڑے۔ دس ماہ کے پیٹ سے ماں میں وہ پھرتی نہیں تھی۔ پھر بھی اس کے ہاتھ ایک سالم روٹی آ گئی۔ لگتا تھا کسی رئیس کی دعوت تھی۔ سب کو کچھ نہ کچھ مل گیا۔ ایسے میں ماں کو ایک بوٹی بھی نظر پڑی جو اخبار کے نیچے سے جھانک رہی تھی اور دعوتِ طعام دے رہی تھی۔ فقیرنی نے بوٹی دیکھ تو لی مگر وہ اس لنگڑے فقیر کے وجود سے بھی خبردار تھی جو اس کے بائیں ہاتھ کوڑا کرید رہا تھا۔ دونوں نے غالباً اس بوٹی کو تاڑ رکھا تھا مگر انجان بنے ہوئے تھے، اس امید میں کہ شاید دوسرے نے نہیں دیکھی۔ پھر اچانک دونوں ایک ساتھ اس پر جھپٹے۔ ایک ہی ہاتھ کا کھیل تھا، دوسرے ہاتھ کے استعمال میں یہ خدشہ کہ ہاتھ کی روٹی بھی نہ چھن جائے۔ اس دھکم پیل میں ایک مرتبہ گری بھی مگر مجال ہے جو مالِ غنیمت سے نظر ہٹے۔ لنگڑے فقیر کو ماں کی کم زوری صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنا وزن اپنے اچھے پیر پر ڈالا اور بے ساکھی کو الٹی طرف پکڑ کر اتنی قوت سے فقیرنی کے پیٹ پر مارا کہ میری تو دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ جیسے کسی نے سر پر ہتھوڑا مارا ہو۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ ادھر حرام زادی پشت

کے بل گری اور روٹی پر اس کی گرفت کم زور پڑ گئی۔ایک بڑھیا فقیرنی جو کناروں پر منڈلا رہی تھی، اس نے موقع غنیمت جان کر روٹی چھینی اور یہ جا، وہ جا۔ماں بہ مشکل اُٹھ سکی۔باقی رات درد سے کراہتی رہی۔منہ میں اُڑ کرَ کھیل بھی نہ گئی۔صبح اُٹھتے ہی لال بتی کا رخ کیا۔اب ان حالات میں اگر میں باہر آنے سے انکاری ہوں تو آپ مجھے کیسے دوش دے سکتے ہیں؟''

ڈاکٹر صائمہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچی تھیں کہ ڈاکٹر عالم کا فون آ گیا۔فون پر مریضہ کا احوال سنا۔شکوہ کیا کہ ابھی گھر پہنچی ہوں۔ایک نئی ڈرپ کا مشورہ دیا اور تاکید کی کہ اگر حالات جوں کے توں رہیں تو آدھے گھنٹے بعد پھر فون کرو۔ڈرپ بھی بدل گئی اور آدھا کیا پون گھنٹہ گزر گیا مگر معاملہ وہیں ٹائیں ٹائیں فش۔اب ڈاکٹر عالم سخت پریشان تھے۔مریضہ کے پاس سے ہل نہیں رہے تھے۔انہوں نے ڈاکٹر صائمہ کو لال بتی میں داخل ہوتے دیکھا تو دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔صائمہ نے تفصیل سے مریضہ کے حالات دریافت کیے پھر پیٹ کا معائنہ کیا۔کانوں میں آلہ لگا کر بچے کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔سب معاملہ بہ ظاہر تیار مگر الٰہی پھر کیا دیر ہے؟ چہرے پر تردّد کے آثار نمودار ہوئے۔اب انہوں نے مریضہ کے رحم کا اندرونی معائنہ شروع کیا۔پیروں پر چادر ڈال کر ٹٹولا، جیسے بچے سے بہ راہِ راست سلکی رابطہ ملا رہی ہوں۔اچانک چہرے کے تاثرات بدل گئے جیسے معاملہ سمجھ میں آ گیا ہو۔اُٹھ کر دوبارہ اسٹیتھو اسکوپ نکالا اور فقیرنی کے پیٹ پر رکھا۔تقریباً ایک منٹ تک نہایت انہماک سے سنتی رہیں پھر مڑ کر ڈاکٹر عالم کا سامنا کیا۔''یہ بچہ ابھی دنیا میں آنے کے لیے تیار نہیں۔مریضہ کے بجائے دنیا کو ایک نئی ڈرپ لگاؤ۔''انہوں نے گویا تشخیص اور علاج دونوں بتا دیے اور پلٹ کر باہر چل دیں۔

☆☆☆☆☆





# موٹا

گھنٹی بجنے سے پندرہ منٹ پہلے ہی سب بچے اپنی کتابیں سمیٹ کر بستوں میں رکھ چکے تھے۔چہرے امید سے دمکتے، کان، آنکھ، ناک، سب گھنٹی کی آواز پر لگے تھے۔اگر تمام حواس سن سکتے تو اس وقت سب بچے اپنے خمسہ حواس صرف گھنٹی کی آواز پر مرکوز رکھتے۔ایسے میں گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی سب دروازے کی طرف لپکے۔ایک دو راستے میں ٹکرائے یا لڑکھڑائے بھی لیکن جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔سب بچوں کے چہروں پر اچانک پھر تازگی دکھائی دے رہی ہے۔مسکراتے، دمکتے چہرے، سارے دن کی تھکن، اگلے چند گھنٹوں کے لیے پھر سے غائب ہے۔اسکول کے سبق، ٹیچر، ڈسپلن اگلی صبح تک کے لیے سب عذابوں سے چھٹکارا ہے۔لیکن دوسرے بچوں کی مانند زبیر کو کوئی جلدی نہیں ہے۔ہر روز کی طرح گھنٹی بجتے ہی اس کی کوئی کتاب یا پنسل زمین پر گر پڑی ہے اور انہیں سمیٹ کر بستے میں رکھنے میں اتنا وقت نکل جاتا ہے کہ باقی بچے نکل جائیں اور زبیر سب سے آخر میں مرے مرے قدموں سے تنہا باہر نکلے۔اگر گھنٹی بجنے سے چند منٹ پہلے آ کر ٹیچر سے کوئی سوال کر لو تو اس سے بھی خاصا وقت بیت جاتا ہے۔کلاس سے نکل کر اسکول گیٹ تک پہنچنا زبیر کی روزانہ زندگی کا سب سے طویل سفر ہے۔'موٹے، آلو، فٹ بال' کی آوازیں اس کی شخصیت میں ایسے سوراخ کرتی تھیں کہ اس کی روح اب نشانہ بازی کے ٹارگٹ کی مانند نظر آتی ہے۔ہر طرف سے چھدی۔دل کے اطراف ایسے سوراخ جیسے کسی چاند مار نے اپنی مہارت کا ثبوت چھوڑنا ضروری سمجھا ہو۔

UrduDost.com

آج بھی زبیر سب سے آخر میں کلاس سے نکلا۔ برآمدے میں ہر روز اس کی خواہش ہوتی کہ عمروعیار کا کمبل اوڑھ کے غائب ہو جائے۔ جب سے داستانِ امیر حمزہ پڑھی تھی، عمروعیار کے کمبل کے لیے وہ کچھ بھی دے سکتا تھا۔ وہ ریل کا سیٹ بھی جو پچھلی سال گرہ پر ملا تھا اور ابھی تک زبیر کا سب سے چہیتا کھلونا تھا۔ دائیں بائیں دیکھا، سب بچے جا چکے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی امید کی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اچانک اس کے قدموں میں زندگی دوڑ گئی تاکہ وہ جلد از جلد اس حد کو پار کر لے جس کے قدم قدم پر طفلانہ تنگ نظری کی بارودی سرنگیں بچھی تھیں۔ تین چار قدم ہی لیے تھے کہ 'موٹا' کی آواز برمے کی طرح سماعت پر گری۔ اس کے جسم کے خالی کھنڈر میں یہ گونج اِدھر اُدھر ٹکراتی رہی۔ اس کے قدم من من کے ہو گئے۔ ہائے عمروعیار کی زنبیل۔ ستون کے پیچھے سے اکرم، اقبال اور مسعود نکل آئے۔ ''بھاگ رہا تھا آ لو'' مسعود ان تین شیطانوں کی ٹولی کا گویا سرغنہ تھا جیسا کہ اس قسم کی ٹولیوں میں ہوتا ہے۔ کوئی باقاعدہ چناؤ نہیں بلکہ سب سے زیادہ جثہ ور اور سنگ دل خود بہ خود لیڈروں کا رول لے لیتا ہے۔ ایسے ہی اپنی کاٹھی اور سخت دلی کی بہ دولت مسعود اس گروہ کا سالار تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ کلاس کے باقی بچوں سے پورے ایک ہاتھ اونچا تھا۔ غضب کا پھرتیلا، کلاس کے کچھ بچے اس کا خاص نشانہ تھے اور زبیر ان میں سرِفہرست تھا۔ زبیر نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کندھے اُچکائے جیسے کہہ رہا ہو سب ٹھیک ہے، حالات معمول کے مطابق ہیں۔ حالاں کہ صاف وشفاف روشن دن پر اچانک تاریکی کے بادل چھا چکے تھے۔

''انٹرول میں بھی چھپ گیا تھا'' مسعود نے زبیر کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''بستے میں کیا ہے؟ تمہارا بستہ اتنا بھاری کیوں ہے؟'' اکرم نے اس کا بیگ کھینچا۔ ''موٹا اتنا وزن آرام سے اُٹھا لیتا ہے۔'' اقبال نے لقمہ دیا۔ زبیر نے تھوک نگلا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے سب سنتا رہا۔ مسعود نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کے اکلوتا روپیہ قبضے میں کر لیا۔ غصہ دکھانے سے حالات اور بگڑ سکتے تھے۔ شروع میں ایک دفعہ اس نے جوابی کارروائی کی کوشش کی تھی مگر پٹنے کے بعد اس کا رویہ مدافعانہ تھا۔ ''نہیں یار... میں تو خود انٹرول میں تم لوگوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔'' گو زبیر اب بہت آرام سے جھوٹ بول لیتا تھا۔ پھر اس کو اپنی آواز خود ہی اجنبی سی لگی۔ آج بھی زبیر آدھے گھنٹے دیر سے گھر پہنچا۔

زبیر کا گھر متوسط طبقے کے ایک محلے میں تھا۔ گھر کے باہر اس کے کندھوں جتنی اونچائی کی ڈیڈونیا کی باڑ تھی۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ نما گھاس کا ٹکڑا، لوہے کے گیٹ کے دونوں



UrduDost Library

طرف اینٹوں کے ستون ایستادہ تھے۔ جن پر بڑے بڑے بجلی کے گلوب لگے تھے۔ ایک ستون پر گھنٹی لگی تھی۔ دوسرے پر زبیر کے باپ کے نام کی تختی 'مجید احمد'۔ تین کمروں کا مکان جس میں زبیر، اس کے دو بھائی اور ایک بہن، ماں باپ اور دادی، دادا رہتے تھے۔ ایک کمرے میں ماں باپ اور اس کی بہن، دوسرے میں دادی، دادا اور تیسرے میں تینوں لڑکے۔ مجید صاحب واپڈا میں میٹر ریڈروں کے سپروائزر تھے۔ ایک عدد ستّر سی سی کی کالی ہونڈا موٹر سائیکل باہر چبوترے پر کھڑی رہتی۔ صبح کے نکلے شام ڈھلے گھر لوٹتے۔ بچوں سے عموماً رات کے کھانے پر ملاقات ہوتی۔ ایک کمانے والا اور سات گنوانے والے! چھٹی کے روز بھی ایک دوسری ملازمت کر رکھی تھی کہ بھرم قائم رہے۔ ایسے میں اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ بچوں سے ان کے اسکول کے حالات تفصیل سے دریافت کریں۔ سرسری سوالات کا سرسری جواب مل جاتا تھا۔ ویسے بھی رات کے کھانے کی میز پر سب کی کوشش ہوتی کہ خوش گوار باتیں ہوں۔ مسائل اور شکووں سے پرہیز۔ زبیر کو یقین نہیں تھا کہ اگر مجید صاحب بہ راہِ راست پوچھتے تب بھی وہ مسعود یا اس کے ٹولے کے بارے میں بتا سکتا۔

گھر کا پچھلا دروازہ 'گلی' میں کھلتا تھا جہاں محلے بھر کے بچے شام میں کرکٹ اور ہاکی کھیلتے۔ زبیر بھی اکثر ان میں شامل ہونے کی کوشش کرتا۔ یہاں بھی وہ 'موٹے' کے نام سے زیادہ پکارا جاتا۔ محلے کے بچے اسے زیادہ تو نہ ستاتے لیکن کرکٹ یا ہاکی کے دونوں کھیلوں میں کوئی اسے اپنی ٹیم میں لینے پر راضی نہ ہوتا۔ یار تم پھسڈی ہو، بھاگتے تو ہو نہیں۔ زبیر نے اس کا توڑ یہ نکالا کہ ضد کر کے اپنے والد سے پیروں پر باندھنے کے پیڈ منگوا لیے، اب اس کی شرط ہوتی کہ کھلاؤ تو پیڈ دوں گا۔ یوں اس کی افادیت کچھ بڑھ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اگر ٹیم میں شامل ہو بھی جائے تو بھی اس کا نمبر ہمیشہ گیارہواں ہوتا۔ ہاں اگر اس کا کوئی بڑا بھائی ٹیم کا کپتان بنتا تو زبیر کی بھی لاٹری نکل آتی اور وہ ساتویں، آٹھویں نمبر پر بھیج دیا جاتا۔ مگر کھیل کی روانی میں تو اکثر اس کے بھائی بھی اسے 'موٹا' کہہ دیتے جو زبیر کو ذرا برا نہیں لگتا۔ گھر میں اگر امی یا دادا، دادی سن لیتے تو خوب خبر لیتے۔ اس لیے گھر میں تو ہمیشہ وہ زبیر ہی رہتا لیکن کھیل کے ہنگامے میں باقی بچوں کے ساتھ اس کے بھائی بھی اس کا اصل نام بھول جاتے۔

یوں زبیر کی زندگی ایک پالتو کی مانند ہو گئی تھی اور بچوں کے مقابلے میں اس کا زیادہ وقت گھر کے اندر گزرتا جہاں بچے باہر کھیلنے کے مواقع ڈھونڈتے۔ زبیر گھر کے اندر رہنے کے بہانے

تراشتا۔ اسکول کی طرح محلے کا بھی ایک مسعود تھا جو اکثر و بیشتر زبیر کی جان کھاتا۔ گو اس نے اپنا نام سردار رکھا ہوا تھا۔ اپنے دوسرے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں زبیر انتہائی فرماں بردار اور گھریلو بچہ تھا۔ دادا، دادی کا محبوب اور ماں کی آنکھ کا تارا۔ زیادہ تر وہ ان ہی کے گرد منڈلاتا رہتا۔ اس کے بزرگ اس کی بیرونی دنیا کی فوبیا کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یوں زبیر نے اپنی علاحدہ، مختصر مگر تنہا دنیا تراش لی تھی۔ جس میں وہ سکون سے اور محفوظ رہتا تھا۔ ہاں اکثر اس احتیاط سے تراشی دنیا میں لفظ 'موٹا' ایک زلزلے کی مانند گہرے شگاف ڈال دیتا اور زبیر کی شخصیت مزید سمٹ کر اس کی چھوٹی سی دنیا کے کسی اندرونی تہ خانے میں جا چھپتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا میں صرف دادا، دادی، ماں اور باپ ہی کیوں نہیں باقی لوگوں کی کیا ضرورت ہے۔ خاص کر مسعود، اکرم، اقبال اور سردار تو اسے بالکل اضافی اور بلاضرورت محسوس ہوتے تھے۔

زبیر اپنے بزرگوں کا یوں بھی دلارا تھا کہ تعلیمی میدان کا شہ سوار تھا۔ وہ اپنی کلاس کے دوسرے بچوں کو بہت آرام سے پیچھے چھوڑ دیتا۔ ہر امتحان کے نتیجے کی فہرست میں زبیر کا نام شروع کے تین بچوں میں ہوتا۔ امتحانات کے قریب تو مسعود کا رویہ بھی بدل جاتا۔ مسعود پڑھائی میں بالکل پھسڈی تھا۔ لیکن امتحان میں اس کی کرسی عموماً زبیر کے قریب ہوتی۔ ایسے میں جیسے جیسے امتحان قریب آتے جاتے...لگتا تھا مسعود کی آنکھوں پر دبلاپے کا چشمہ لگ گیا ہو کہ اس کو زبیر کا موٹاپا بالکل نظر نہ آتا اور تو اور، وہ دوسرے بچوں کو بھی زبیر کو چھیڑنے سے روکتا۔ قیمتاً زبیر کو اکثر امتحانی سوالات کے جواب بتانے پڑتے۔ کبھی جوابات کی کاپی یوں پکڑتا کہ مسعود جواب پڑھ سکے۔ کبھی سرگوشی میں جواب بتانے اور کبھی انگلیوں کے اشارے سے صحیح جواب کی نشان دہی بھی کر دیتا۔

اِدھر امتحانات ختم ہوئے اور اُدھر مسعود نے رنگ بدلا۔ پھر وہی 'موٹا'، اس سے پیسے چھین لینا اور ہر طریقے سے دِق کرنا۔ زبیر اس سارے کھیل سے واقف ہونے کے باوجود ہر سال بے وقوف بننے کو تیار رہتا۔ یہ سب سہنے کے باوجود وہ جب ماں کی چھایا میں آتا تو اس کے سب عذاب گویا ڈھل جاتے۔ فربہی اس کا تشخص نہ ہوتی، وہ صرف زبیر ہوتا۔ نہ دبلا نہ موٹا، نہ اونچا نہ چھوٹا۔ صرف زبیر۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ ماں افطار پر بہت انتظام کرتی۔ چنے کی دال، پالک کے پکوڑے، چھولے عموماً دسترخوان کی زینت بنتے۔ عصر تک روزہ مشکل سے کٹتا۔ لیکن عصر کے بعد وہ اپنے آپ کو کام میں ایسا مصروف کر لیتی کہ کھٹ سے مغرب ہو آئے۔ ایسے میں مزاج ذرا زود رنجی کی طرف





مائل ہو جاتا ہے۔ شروع کے روزے چھوٹے اور نسبتاً آسان تھے لیکن اب اٹھارہویں روزے تک دورانیہ بڑھتا جا رہا تھا۔ روز سحر و افطار کے چکر نے ماں کی قوتِ برداشت بھی کم کر دی تھی۔

''ذرا نکڑ سے دہی لا دو تو میں پھلکیوں کے لیے پھینٹ دوں۔'' یہ جملہ وہ دو تین بار ایسے درمیان میں گرا چکی تھی جیسے کوئی بچہ خود بہ خود اُچک لے گا اور لپک کر لے آئے گا۔ اگر کسی سے خصوصاً نہ کہا جائے تو فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی لے آئے گا اور نقصان یہ کہ شاید کوئی بھی دھیان نہ دے۔ زبیر کے دونوں بڑے بھائی روزے سے تھے اور سنی ان سنی کر رہے تھے۔ جھٹ پٹے کے وقت بہن کے باہر نکلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دادا جی بھی روزہ رکھ تو لیتے تھے لیکن اس کے بعد اتنی سکت نہ رہ جاتی کہ عین افطار سے پہلے دہی لینے دوڑے جاتے۔ زبیر جو پہلے ہی 'نکڑ' کے تین چکر لگا چکا تھا۔ ایک دفعہ پالک لینے، ایک دفعہ بیسن اور ابھی آدھے گھنٹے پہلے ہی ماں کو یاد آیا تھا کہ وہ املی بھول گئی ہے۔ زبیر اس چکر میں سردار کو باہر دیکھ چکا تھا اور بچ بچا کے گھر پہنچ گیا تھا۔ ادھر ماں اب جھن جھلا رہی تھی۔ ''دہی کے بغیر پھلکیاں سب بے کار جائیں گی۔'' ایسے میں شامتِ اعمال زبیر باورچی خانے کے سامنے سے گزرا۔

''زبیر بیٹا جان...ذرا دہی تو لا دو۔'' ماں نے آواز میں خوشامد آمیز ممتا کو سمو دیا۔ مگر زبیر سردار کی باہر موجودگی بھولا نہیں تھا۔ ''امی میں تھک گیا ہوں۔ اب کسی اور کو بھیج دیں۔'' زبیر نے جواب دیا۔ ''موٹو صرف تم ہی بغیر روزے کے ہو۔ لہٰذا خاموشی سے لے آؤ۔'' زبیر کے بڑے بھائی نے گھر کا۔ اس بھوک پیاس میں امی یا دادا نے موٹا کہنے پر بھائی کو ڈانٹ بھی نہ پلائی۔

''بھائی صحیح کہہ رہا ہے، صرف تمہارا ہی روزہ نہیں ہے موٹو۔'' ماں نے اپنا یہ جملہ درمیان میں ہی نامکمل چھوڑ دیا۔ زبیر کو ماں نے پہلی بار زندگی میں 'موٹو' کہا تھا۔ زبیر نے غیر یقینی سے ماں کو دیکھا جو پہلے ہی اپنے منہ پر دوپٹہ رکھ چکی تھی۔ زبیر کو اچانک عمرو عیار کی زنبیل بہت یاد آئی۔ یک دم آنکھیں بھر آئیں۔ ایسا لگا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی نے اسے 'موٹا' کہا ہو۔ اسے اچانک اپنی چھوٹی سی گھر کی دنیا بھی غیر محفوظ لگی۔

''اچھا میں ہی لے آتا ہوں۔ مسعود تم اِدھر ہی ٹھہرو۔'' زبیر جیسے بھائی کا نام ہی بھول گیا۔ اس نے پیسے مٹھی میں دبائے اور دفعتاً دروازے سے باہر بھاگ گیا۔

☆☆☆☆☆

# تعویذ

''باہر آ جاؤ بھئی''

اس نعرے کی کشش صرف وہ ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے جولائی کی چل چلاتی دھوپ میں سوڈگری سے اوپر درجہ حرارت میں گلی میں ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، گلی ڈنڈا کھیلا ہو۔ آواز سنتے ہی میں نے نوالہ جلدی سے نگل لیا اور پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ درزدیدہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھا جو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔

''لعنت ہو کم بختوں پر، جیسے باہر چاندنی چٹکی ہوئی ہو۔ ارے کہیں لو نہ لگ جائے۔''

متوسط طبقے کے اس محلے میں عموماً لڑکے گلی میں کرکٹ سے دل بہلاتے تھے اور سچ یہ ہے موت اور گاہک کی طرح کرکٹ کا کوئی وقت معین نہیں ہوتا۔ گرمیوں میں دھوپ کی تمازت اور سردیوں میں صبح وشام کی یخ بستہ سردی کرکٹ کو روکنے سے قاصر ہے۔ گنجان آبادی میں میدان وغیرہ کی عیاشی ترقی پذیر ممالک کا شیوہ نہیں۔ حیدرآباد کی جولائی میں موسم کا پارہ چڑھا ہی رہتا ہے۔ اس پر لو کے جھکڑ، معلوم ہوتا ہے آپ تنور کے قریب کھڑے ہیں۔ گھر سے نکلنے سے پہلے والدین بچوں کو سکنجبین پلاتے۔ موٹر سائیکل سوار منہ پر گیلا رومال رکھ لیتے، مگر اس پس منظر میں ''باہر آ جاؤ بھئی'' کا نعرہ لڑکوں کو کشاں کشاں گھروں سے باہر لے آتا۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اماں کو پتا تھا کہ لعن طعن کے باوجود میں جلد یا بہ دیر آنکھ بچا کے باہر نکل جاؤں گا اور ہوا بھی یہ ہی۔ باہر شکیل، امجد، انصار اور شفیق پہلے ہی اس دعوت نامے پر لبیک کہہ چکے تھے۔ یہ تعداد بہت خوش آئند تھی۔ ذرا گیند کے بلے سے لگنے کی ٹھک ٹھک آواز نکلنے کی دیر





ہے، باقی ''لعنت کے مارے'' بھی برداشت نہ کر سکیں گے اور دھیرے دھیرے گھروں سے باہر نکل آئیں گے۔ وکٹوں کی جگہ لکڑی کا خالی کریٹ ایستادہ تھا۔ گیند اندازی کی جگہ کی نشان دہی کے لیے وہاں ایک اینٹ رکھ دی گئی تھی۔ گیند کو زیادہ تیز اور مشکل بنانے کے لیے اس پر ٹیپ لپیٹ لیا تھا۔

''پہلے بیٹنگ کون کرے گا۔'' میں نے سوال کیا۔

مجھ سمیت اس وقت تک پانچ کھلاڑی جمع تھے۔ اگر ان پانچوں میں سے کوئی پہلے بیٹنگ کا خواہش مند نہیں ہو تو ضرور اس کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ بھئی ابھی بیٹنگ کر لو مستقبل کی کیا خبر۔ کسی گھر کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جائے تو کھیل وقت سے پہلے ختم۔ دوسرا خطرہ یہ کہ اگر پہلا بلے باز اچھا کھلاڑی ہو تو باقی لوگوں کی ساری دوپہر پدی لگا سکتا ہے۔

''چل شکیل نمبر کاڑھ یار۔''

شکیل نے انصار کے روبرو کھڑے ہو کر اپنا دایاں ہاتھ اس کے کندھے پر سے گزار کے اس کی پشت پر پھیلا دیا اور دو انگلیاں اُٹھا دیں۔

انصار نے کہا ''یعنی شفیق دوسرے نمبر پر بیٹنگ کرے گا۔ انصار کیوں کہ شکیل کے ہاتھ کی انگلیاں دیکھے بغیر نام پکار رہا ہے، لہٰذا اس میں دیانت کا عنصر خود بہ خود شامل ہو گیا۔ اب شکیل نے پانچ انگلیاں اُٹھائیں۔ انصار بولا ''تم''۔ یعنی شکیل نمبر ۵ پر کھیلے گا۔ شکیل نے سڑا سا منہ بنایا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بعض کمینے ایسے بھی ہیں جو انگلیاں اُٹھاتے وقت ہلکا سا شانہ دبا دیتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے عموماً ''انگلی اُٹھانے والا اور نمبر بولنے والا نمبر ایک اور دو پر بلے بازی کرتے ہیں۔

کھیل خوب جما۔ گرمی بہت تھی مگر کھیل کا جوش جیسے پنکھے کا کام کر رہا تھا۔ پسینہ بہہ رہا ہے۔ قمیض پشت سے چپکی ہوئی ہے مگر انہماک میں ذرا کمی نہیں۔ ہر گھنٹے بعد کوئی لڑکا اپنے گھر سے جگ میں پانی لے آتا اور کھیل پھر جاری۔

گلی کے سامنے والی قطار ''مکانوں'' کی تھی۔ یہ تین سے چار کمروں والے آسودہ حال لوگ تھے۔ کچھ کے پاس پرانی کاریں بھی تھیں۔ اتفاقاً ہمیشہ ایسے ہی کسی لڑکے سے پانی کے لیے کہا جاتا جو سامنے والی قطار کے گھر سے آیا ہو۔ گلی کی پچھلی جانب عموماً ان لوگوں کے ''گھر نما'' تھے جنہیں آپ غریب طبقہ کہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے پاس سائیکل تھی۔ اِکّا دُکّا موٹر سائیکل بھی۔ اتفاق دیکھیے کہ ان گھروں سے کبھی پانی کی ضرورت نہیں پڑی۔ بہت معاملہ فہم محلّہ تھا ہمارا۔

خیر میں آپ کو اس دن کی کرکٹ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ انصار جلدی آؤٹ ہو گیا۔ تو شفیق کا نمبر آیا۔ اس نے گلے میں پڑا تعویذ چوما، آنکھوں سے لگایا اور گیند کا سامنے کرنے کھڑا ہو گیا۔ خوب جم کے بیٹنگ کی اس نے صاحب۔ مجھے یاد ہے اس دن شفیق نے ہم سب کی خوب درگت بنائی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگر بہت دیر تک ایک ہی آدمی جما رہے تو پھر سب کو گرمی ستانے لگتی ہے۔ پسینہ گیند پر ملتے ہیں کہ شاید کسی حربے سے آؤٹ ہو جائے۔ معاف کیجیے گا میں ہمیشہ کرکٹ کا دُکھڑا لے کے بیٹھ جاتا ہوں۔

میں آپ کو شفیق کے بارے میں بتا رہا تھا۔ شفیق کا پچھلی قطار میں نسبتاً ''پتلے حال'' کا گھر تھا۔ درمیانہ قد، گندمی رنگت، چہرے پر ہمیشہ ایک بشاشت رہتی۔ شاید پرائمری یا مڈل پڑھ کے اسکول چھوڑ چکا تھا۔ مجھ سے عمر میں دو سال بڑا۔ اس کا مقامی سینما میں سائیکل اسٹینڈ کا ٹھیکہ تھا۔ میرا میڈیکل اسکول میں داخلہ ہو چکا تھا، بس کلاسیں شروع ہونے کا انتظار تھا۔ ہمارے تعلقات، اگر آپ اس کو کوئی نام دینے پر بہ ضد ہیں، ابنِ صفی کے ناول اور شاید گلی میں کرکٹ کے کھلاڑیوں کی تعداد پر استوار تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر پہلی قطار والے مکانوں میں مناسب تعداد میں لڑکے ہوتے تو شاید یہ دوستی نہ پنپ سکتی۔

کوئی شام سات بجے کھیل ختم ہوا۔ اس وقت تک نو لڑکے جمع ہو چکے تھے۔ زیادہ تر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

''آیئے آپ کو چائے پلاؤں اور ہاں عمران سیریز کا نیا ناول کل سینما کے پاس ٹھیلے پر بک رہا تھا میں نے اُٹھا لیا۔'' شفیق نے ایسی دعوت دی جو میں ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ شفیق گو عمر میں مجھ سے بڑا تھا مگر ہمیشہ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتا۔ جب کہ میرے تئیں میری اس سے ''تم'' کی بے تکلفی تھی۔ لیکن میں نے اسے کبھی ''آپ'' کہنے پر ٹوکا بھی نہیں، بھئی اگر وہ اس میں خوش ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ اس کی دل شکنی کروں۔

شفیق کا گھر اینٹوں کا تھا، پلاسٹر کی ضرورت سے بے نیاز۔ لکڑی کے دروازے پر زنجیر پڑی تھی جو چٹخنی اور گھنٹی دونوں کا کام دیتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے ایک دالان تھا جس کے ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی رہتی۔ دالان سے منسلک دائیں ہاتھ پر شفیق کا کمرا تھا جب کہ دالان گزر کے ایک کونے میں باورچی خانہ اور اس سے متصل ایک اور کمرا جو شفیق کی ماں اور بہن کی مشترکہ دنیا تھی، باورچی خانے اور شفیق کے کمرے کے درمیان ایک بیت الخلا، جس کا ایک





حصہ نہانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کے شفیق نے گردن میں پڑے تعویذ کو دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹوں تک پہنچایا اور چوم کے گھر میں داخل ہوا۔

''یہ کیا حماقت ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ حماقت نہیں اس سے بہت برکت ہوتی ہے۔ خیر چھوڑو آپ نہیں سمجھو گے۔'' شفیق نے متانت سے جواب دیا۔

''برکت ہوتی ہے۔'' اس کی نقل اُتار کے میں نے اس کی خالی بیٹھک پر طائرانہ نظر ڈالی، گویا اس کی حماقت پر طنز کر رہا ہوں۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر کیا پتا یہ تعویذ نہ ہوتا تو یہ کمرا بھی نہ ملتا اور میں باہر سڑک پر بیٹھا ہوتا؟'' شفیق کی باتیں ایسی ہی عجیب وغریب ہوا کرتی تھیں۔

''خیر اپنی بے وقوفیاں تم ہی جانو'' مجھے اس وقت وہ بہت احمق لگا۔

شفیق نے گھر کے اندر بہن سے چائے کے لیے کہا۔ اس تعویذ کا بھی عجب قصہ تھا۔ شفیق کا اس تعویذ سے عجیب رشتہ تھا۔ کسی نے اسے کبھی تعویذ کے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ چرمی ایک انچ کا مستطیل جس کے کناروں پر سفید دھاگے کی سلائی نمایاں تھی۔ کالے رنگ کا یہ تعویذ ایک موٹے کالے دھاگے سے اس کی گردن کی زینت بنا رہتا۔ کہاں سے آیا، اس میں کیا بند ہے؟ عموماً شفیق ان سوالوں کا جواب ٹال دیتا۔ یار دوست مذاق اُڑاتے۔

''یہ ایک بوتل ہے اور اس کا جن شفیق کا ہر مسئلہ حل کر دیتا ہے۔'' یا یہ کہ ''اس میں اسمِ اعظم تحریر ہے جو اس کی ماں کے پیر نے شفیق کی پیدائش پر تحفہ دیا تھا۔''

شفیق ان فقروں کا برا نہ مانتا۔ دوستوں نے غالباً اس کا امتحان لینے کے لیے یا محض تنگ کرنے کے لیے رعایتاً یا قیمتاً لینا چاہا مگر ہر دفعہ شفیق کا انکار تعویذ کے اسرار کو دو چند کر دیتا۔ شفیق تعویذ سے ایسے چمٹا رہتا جیسے اسی طوطے میں اس کی جان ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دن انصار اس کے پیچھے پڑ گیا تو شفیق نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''یار دوستی کا واسطہ دو گے تو تعویذ کیا جان بھی دوں گا۔'' انصار اس کی سنجیدگی سے ڈر گیا اور بات آئی گئی ہو گی۔ خیر اب واپس آیے کہ اس دن میں شفیق کے کمرے میں بیٹھا چائے سُڑک رہا تھا۔

''بھئی وہ عمران سیریز کہاں ہے، تم نے وعدہ کیا تھا۔'' میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''وہ بھی دیتا ہوں مگر آپ کو میرا ایک کام کرنا ہو گا۔'' اس نے ملتجی سے لہجے میں کہا، ''دراصل

UrduDost.com

آپ کالج جاتے ہیں اور میں فقط رسالے اور ابنِ صفی پڑھ سکتا ہوں اور وہ بھی مشکل سے۔ بس اسٹاپ پر دیکھی ہوگی آپ نے وہ لڑکی۔ روز بس سے اُتر کے سامنے والی گلی میں جاتی ہے۔'' اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا اور چہرہ کسی اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔

میرا گھر سامنے والی قطار کے بالکل آخر میں تھا اور دومنزلہ گھر میں میرا کمرا گیراج کے اوپر سامنے سڑک کے رخ پر تھا۔ بس اسٹاپ میرے کمرے کی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا۔

''اچھا تو پھر'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور اکثر مسکرا کے بھی دیکھتی ہے۔ اب مجھے کوئی اچھا سا شعر یاد کرادو جس سے ذرا بات آگے بڑھے اور اپنی سبکی بھی نہ ہو۔'' شفیق نے اب ذرا کھل کر بتایا۔ اس نے منہ نیچے کیا ہوا تھا جیسے بات کہتے ہوئے شرم سار ہو۔ جملہ ختم کر کے درزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ مجھے گھورتے پایا تو وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ ''یار کس کی بات کر رہے ہو۔'' مجھ سے زیادہ دیر اپنا اشتیاق چھپایا نہیں گیا۔ دل جل کے کباب بھی ہوگیا۔ میں میڈیکل اسکول جانے والا ہوں۔ اچھی پتلون قمیض پہن رکھی ہے۔ کبھی کبھی والد صاحب اپنی پرانی واکس ویگن بھی چلانے کو دے دیتے ہیں۔ یہ میرے ساتھ تو کبھی ایسا حادثہ نہیں ہوا۔ اکثر میں پردے کے پیچھے سے بس اسٹاپ کا معائنہ کیا کرتا۔ کبھی کبھار بس آتی دیکھ کر کسی بہانے سڑک پر بھی نکل آتا۔ مسکرانا تو دور کی بات میری طرف تو کسی لڑکی نے نگاہ بھی نہ ڈالی۔ میں نے یہ بات شفیق کو بتانا مناسب نہ سمجھا۔

''بس آپ شعر لکھ دیں میں یاد کرلوں گا۔'' شفیق کو اپنی پڑی تھی۔

''یار عجیب احمق آدمی ہو۔ لڑکی دیکھ کر اسی کے حساب سے شعر چننا چاہیے۔ موٹی ہے، دبلی ہے، کالی ہے یا گوری۔ مسکراتی ہے تو کیسی لگتی ہے، چلتی ہے تو کیا یاد آتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر ہی ایسا شعر سناؤ گے نا جو اس پر فٹ آجائے، میں نے اسے دلیل دی۔ ''چلیں میں کل آپ کو دکھا دوں گا۔'' شفیق نہ جانے کیوں کچھ نیم دلی سے آمادہ ہوا۔ ''انشااللہ'' کہہ کر اس گدھے نے پھر تعویذ چوم لیا۔ ایسا لگا جیسے تعویذ چوم کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا ہو۔

''اب اسے کیوں چوما ہے۔ کیا اس میں اس کی تصویر بند ہے؟'' میں نے چڑ کر پوچھا۔

''ایسی بات مت کریں۔'' شفیق کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ ''انشااللہ کہا ہے۔ جب کسی کام کا ارادہ کرو اور تعویذ چوم لو تو کام ضرور ہوجاتا ہے۔'' اس کا یقین دیدنی تھا۔

''لڑکی کے معاملے میں بھی، اس سیٹنگ میں بھی تعویذ مدد دے گا؟'' میں نے تمسخر اُڑایا۔



UrduDost Library

''آپ پھر مذاق کر رہے ہیں، کل خود دیکھ لیجیے گا۔ یہ رہی آپ کی عمران سیریز۔'' اس نے ابنِ صفی کی کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

دوسرے دن تقریباً تین بجے میں شفیق کے آنے سے پہلے ہی سڑک پر موجود تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں شفیق کے سامنے اکڑ دکھا رہا تھا مگر دل میں ایک کھد بد تھی کہ اگر اس کو پتا چلے میں میڈیکل اسکول جانے والا ہوں تو شاید......،

''چلیں بس اسٹاپ پر کھڑے ہوتے ہیں۔'' شفیق نے تجویز کیا۔

''پاگل تو نہیں ہو۔'' میں نے ناراضگی سے کہا، ''میں جا کر بس اسٹاپ پر کھڑا ہوں گا کہ ہر آنے جانے والا سمجھے لڑکیاں تاڑنے کھڑا ہوں۔''

''اچھا چلیں تو۔ بس آنے والی ہے۔ اسٹاپ کے سامنے کول کارنر ہے وہاں بوتل پی لیں گے۔ وہاں سے بس صاف نظر آتی ہے۔'' شفیق ہر سلجھن پر آمادہ تھا۔ میں نے بھی رضامندی ظاہر کی تو اس نے گردن سے تعویذ نکال کر چوما اور چل پڑا۔

لڑکی اچھی شکل کی تھی۔ بس سے اُتر کے اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ غالباً شفیق روز کسی خاص مقام پر کھڑا ہوتا ہوگا پھر بس سامنے سے ہٹی تو اس کی نظر کول کارنر پر پڑی۔ شفیق کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ماتھے پر پڑی لٹ کو ایک انگلی سے ہٹایا۔ پھر اچٹتی نظر مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹک کر سنجیدہ ہو گئی۔ شاکی نظروں سے شفیق کو دیکھا اور تیزی سے اپنی گلی میں نکل گئی۔

''دیکھا دیکھا اس نے پھر مجھے smile دی۔'' شفیق بہت خوش تھا۔ فوراً گلے سے نکال کے تعویذ چوما۔ ''دیکھا میرے تعویذ کا کمال۔''

''ہاں یار ٹھیک ہے۔'' میں نے بہ ظاہر لاپروائی سے جواب دیا۔

''اب تو شعر لکھ دیں گے ناں۔'' شفیق وہیں اٹکا ہوا تھا۔

''لکھ دوں گا مگر تین چار دن لگیں گے۔ اچھا سے ڈھونڈ کر نکالوں گا۔ ہاں اپنی عمران سیریز کل لے لینا۔'' میں نے اسے مطمئن کیا۔

اب آپ سے کیا پردہ۔ مجھے پتا تھا کہ شفیق ہفتے میں دو دن میٹنی شو میں سائیکل اسٹینڈ پر ہوتا ہے اور بس اسٹاپ سے غائب ہوگا۔ اگر ایسے میں اتفاق سے مجھے کسی کام سے بس اسٹاپ سے گزرنا ہوا اور وہ بھی واکس ویگن میں تو شاید......

شفیق خوش خوش گھر چلا گیا اور میں یہ کمینی آرزو چھپائے اپنے گھر آ گیا۔

اگلے دن میں اپنے تئیں تیار ہو کر کمرے کی کھڑکی میں پردے کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ارادہ تھا کہ دور سے بس آتی نظر آئی تو جا کر گیراج سے اپنی ڈبیہ باہر نکالوں گا۔ اس سے لڑکی کو میرا گھر بھی نظر آ جائے گا، گاڑی اور لباس کا بھی رعب پڑے گا۔ شفیق تو آج سائیکل اسٹینڈ پر ہو گا۔ بس آنے سے پانچ منٹ پہلے کیا دیکھتا ہوں کہ نکڑ سے شفیق چلا آ رہا ہے اور آ کے ٹھیک اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں کل وہ لڑکی اُتری تھی۔

میں بلا ارادہ تھوڑا سا اور پردے کے پیچھے ہو گیا جیسے باہر سے شفیق مجھے ہی دیکھنے آیا ہو۔ ''یہ احمق اس لڑکی کے چکر میں اپنی نوکری بھی کھو دے گا۔'' میں نے متاسفانہ گویا اپنے آپ کو تسلی دی۔

''اس کی یہ ہی حرکتیں تو انہیں آگے بڑھنے نہیں دیتیں۔'' میرا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

بس آ کر رکی۔ لڑکی نے جیسے ہی شفیق کو دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ مسکراہٹ بھی ڈھکی چھپی نہیں بلکہ دانتوں کی ایک دل کش نمائش، ایک کان سے دوسرے کان کی لو تک لگتا تھا جیسے پورا چہرہ ہنس رہا ہو۔ آج اس نے صاف ہاتھ اُٹھا کر شفیق کو سلام بھی کیا۔ ایسا لگا جیسے شفیق سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو مگر پھر جھجکی اور ارادہ بدل کے سیدھی نکل گئی۔ شفیق اس کے جانے کے بعد کچھ دیر کھڑا رہا پھر وہ سائیکل پر سوار ہو کے نکل گیا۔

میں ابھی تک تپا ہوا تھا۔ یہ اسکول کی لڑکی ہے، بالکل نا سمجھ۔ اسے کیا پتا شفیق بالکل جاہل۔ ویسے بھی کبھی کبھی بس اسٹاپ پر بھی کوئی اچھے لڑکے ملتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں باہر کرکٹ کھیلنے بھی نہیں گیا۔ شفیق سے تین چار دن میں شعر لکھنے کا وعدہ تھا۔ ابھی میرے پاس وقت تھا۔

دوسرے دن میں پھر پُر امید ''تیاری'' کے ساتھ پردے کے پیچھے موجود تھا۔ بس آتی ہوئی دور سے نظر آ گئی۔ میری نظریں شفیق کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس میں اتنی دیر ہو گئی کہ گیراج سے اپنی صابن دانی نکالنے کا وقت نہیں ملا۔ میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتے نیچے اُترا۔ میں نے اتفاقاً اپنے آپ کو اسی جگہ پایا جہاں کل شفیق کھڑا تھا۔ وہ لڑکی اس دن بھی بس سے اُتری۔ آج اس کے چہرے پر پہلے ہی سے مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ہمت کر کے اس کو بتا دوں گا کہ شفیق بالکل اَن پڑھ ہے اور اس کا سائیکل اسٹینڈ کا ٹھیکہ ہے... وغیرہ۔ میرا فرض ہے کہ اس نادان لڑکی کو اس خطرے سے آگاہ کروں جس سے وہ کھیل رہی ہے۔ لڑکی نے جیسے ہی مجھے دیکھا اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ چہرے پر بے زاری اور تنفر واضح بکھرا ہوا تھا۔ تیوریوں پر بل ڈال کے میری طرف بڑھی۔





''آپ لوگوں سے ایسی ہی امید کی جا سکتی ہے۔'' یہ کہہ کے یہ جا وہ جا۔

میں پہلے تو ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر مارے شرمندگی کے مرے مرے قدموں سے گھر چلا آیا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی۔ یہ بھی خطرہ لاحق کہ یہ لڑکی اب شفیق سے جڑے گی۔ محلے میں سب لڑکوں کو پتا چل جائے گا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ اس لڑکی کو سمجھاؤں۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔ مجھے یقین تھا کہ سامنے کی قطار والے گھروں کے لڑکے یقیناً میری بات سمجھ پائیں گے۔ اس دن شام میں پہلی مرتبہ میں نے ''باہر آ جاؤ بھئی'' کے نعرے کو بھی نظر انداز کیا اور لڑکوں کے ساتھ شفیق کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ مگر میں اپنے کمرے میں ہی گھسا رہا۔ دو دن بعد ہمت کر کے میں نے پھر کرکٹ کے بہانے قدم باہر نکالا۔ میں نے اس دوران دو فراز کے اور دو مصطفیٰ زیدی کے اشعار ایک کاغذ پر لکھ لیے تھے۔ کھیل کے دوران ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب مجھے ہی دیکھ رہے ہوں۔ امجد بہ ظاہر تو گیند پھینکنے کے لیے وکٹ کی طرف بھاگ رہا ہے مگر اصل میں اس کی ترچھی نگاہیں مجھ پر جمی ہیں۔ انصار ویسے تو چوکا لگانے کی فکر میں ہے مگر اس کے انہماک میں خلل یوں پڑ رہا ہے کہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہیں اور تو اور شکیل جو گیند کے پیچھے بھاگ رہا ہے وہ بھی مڑ مڑ کے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے شکایتی نظروں سے شفیق کی طرف دیکھا۔ مگر اس کا دھیان میری طرف بالکل نہیں تھا۔ وہ بہت انہماک سے وکٹ کیپر بنا ہوا تھا۔

یہ دراصل میرے اندر کا چور ہے۔ میرے سائیکاٹرسٹ دماغ نے مجھے تسلی دی۔ اس کے بعد میں بھی ایسے خوش باش کھیل میں شامل رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کھیل ختم ہونے پر بھی شفیق میری جانب نہیں لپکا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ پلٹ کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ''ارے شفیق یار میں تمھارے لیے شعر لکھ کر لایا ہوں اور تم ہو کے بھاگے جا رہے ہو۔'' میں نے بلا تکلف اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جیسے بے غرض اور بلا تکلف دوستی ہی میرا شغل ہے اور ہاں یہ تمھاری عمران سیریز بھی لے آیا ہوں۔''

''اچھا ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔'' شفیق نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''آیئے گھر آیئے... وہاں آپ کو چائے پلاتا ہوں اور پھر شعر بھی یاد کروا دیجیے گا۔''

شفیق کا لہجہ معمول کا تھا۔ مجھے پتا نہیں کیوں اس کا لہجہ طنزیہ لگا۔ گھر میں داخل ہو کے شفیق نے اپنی بہن کو چائے کے لیے آواز دی۔

UrduDost.com

’’تشریف رکھیے۔‘‘

’’ارے شفیق میں نے تمہیں گھر میں داخل ہوتے ہوئے تعویذ چومتے نہیں دیکھا۔‘‘ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

’’دراصل آپ کے گلے میں یہ تعویذ نہیں تھا اسی لیے آپ کو ناکامی ہوئی۔‘‘ شفیق نے یہ کہہ کر گلے سے کالا دھاگا اُتارا اور تعویذ سمیت مجھے پہنا دیا۔ میں نے شرمندگی سے آنکھیں نیچی کر لیں۔’’اب یہ تعویذ میرے کام کا نہیں رہا، میرا اس پر سے اعتبار اُٹھ گیا۔‘‘ شفیق مستقل ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے پلٹ کے باہر کی راہ لی۔

’’اور ہاں میں نے شکیل، انصار وغیرہ کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ آپ پریشان مت ہوں۔‘‘ مجھے پشت سے اس کی رندھی ہوئی آواز آئی۔

☆☆☆☆☆



UrduDost Library

# بھرم

نئے ہائی اسکول میں پہلا دن ایسا ہوتا ہے جیسے بچہ بھیڑ میں ماں باپ سے جدا ہو جائے۔ آنکھیں چاروں طرف گھوم رہی ہوتی ہیں۔ شاید کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے جائے۔ اَن جانے بر آمدے، اجنبی اساتذہ، اپنی کارکردگی پر عدم اعتماد، نئی کتابوں، نئی لکھائیوں کا بوجھ، سب مل کر ذہنی کیفیت میں بے چینی پیدا کرتے ہیں۔ اکثر اسکولوں میں چند ساتھی طلبہ پرانے اسکول سے ساتھ آ جاتے ہیں اور دوستی کے رشتے مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ایسا طالب علم جس کے پرانی ساتھیوں میں کوئی بھی نئے اسکول میں ساتھ نہ ہو بالکل ایسا محسوس کرتا ہے جیسے قربانی سے پہلے قربانی کا جانور۔ جاوید بھی ایک گورنمنٹ مڈل اسکول سے اس انگریزی گرامر اسکول میں پہنچا تھا۔ یہ اَن ہونی بات تھی۔ گورنمنٹ اسکول سے گرامر اسکول میں پہنچنا ایسا ہی تھا جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ کسی بھی عزت دار مخمل کے ٹکڑے میں ایک آدھ پیوند تو ہو سکتا ہے مگر جس مخمل میں کئی ٹاٹ کے پیوند ہوں وہ خاک مخمل ہوا۔

گیارہویں جماعت کے اس کمرے میں ستائیس لڑکے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ کئی لڑکے ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے اور ایک دبے دبے جوش سے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مشغول تھے۔ جاوید کی طرح اِکّا دُکّا ہی بچہ تھا جو تنہا اور گم شدگی کا اشتہار محسوس ہوتا تھا۔ کلاس میں استاد داخل ہوا تو خاموشی چھا گئی۔ کتنی دل چسپ بات ہے کہ نئے اسکول اور نئی جماعت میں پہلے چند دن استاد کے داخل ہوتے ہی خاموشی سی چھا جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ بہت عام سے استاد تھے، تقریباً پینتیس کا سن، چہرے پر گول عدسوں کی عینک، پتلون اور شرٹ میں ملبوس۔ سامنے کے

UrduDost.com

بال ابھی سے غائب ہو رہے تھے اور حد بندی پیچھے کی جانب کھسک گئی تھی۔ نہ بڑی بڑی مونچھیں نہ ہاتھ میں چھڑی۔ حد یہ کہ ہاتھ میں حاضری کا رجسٹر تک نہیں۔

''میرا نام کامران ہے۔ آپ لوگ مجھے سر کامران کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ میں آپ کو فزکس پڑھاؤں گا لیکن پہلے ذرا تعارف ہو جائے۔ کون بچہ کہاں سے آیا ہے اور اس کا کیا نام ہے۔ اس سے آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے دوستی کرنے میں بھی آسانی ہو گی۔ ہاں آپ سے شروع کرتے ہیں۔'' ٹیچر نے سب سے اگلی نشست میں داہنے کنارے سے شروع کیا۔

''سر میرا نام اقبال ہے اور میں کانونٹ میری سے آیا ہوں۔''

''اقبال آپ کے والد کیا کرتے ہیں۔'' سر کامران نے اشتیاق سے سوال کیا۔

''جی وہ کمشنر کے دفتر میں سیکشن آفیسر ہیں۔''

''بہت خوب...اور بیٹا آپ؟''

''سر میرا نام مقیم ہے اور میں کنٹونمنٹ سے آیا ہوں۔''

''اور مقیم آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟''

''سر وہ آرمی میں کرنل ہیں۔''

''واہ بھئی...شاباش۔'' سر کامران پتا نہیں مقیم کو اس کے والد کی کرنلی پر شاباش دے رہے تھے یا اس کے فیصلے پر کہ وہ ان کا شاگرد بنا۔

''جی بیٹا آپ۔''

''سر میرا نام ارشد ہے میں سینٹ پیٹر سے آیا ہوں۔ میری ممی کا بوتیک ہے۔''

''اور آپ کے ابو۔''

''سر وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔''

''ارے۔'' سر کامران حیرت زدہ رہ گئے۔ ''آپ کی ممی اکیلے ہی اتنا زبردست کام کر رہی ہیں۔ آپ کلاس کے بعد مجھ سے ملیے گا۔'' نہ جانے کیوں جاوید کو سر کامران بہت ندیدے لگے اسے لگا جیسے سر کامران نے ہاتھ کی پشت سے اپنی رال صاف کی ہو۔ جاوید کے برابر میں بیٹھے لڑکے کا نمبر آیا تو جاوید کا دل چاہا کہ وہ ڈیسک میں چھلانگ لگا دے اور ڈیسک اسے نگل لے، یا سر کامران اس سے پوچھنا بھول جائیں۔

''جی بیٹے آپ؟'' سر کامران کی نظریں اس پر جمی تھیں۔



UrduDost Library

''سر میں جاوید ہوں۔ گورنمنٹ اسکول سے آیا ہوں۔''

''پھر سے کہو شاید میں نے صحیح سنا نہیں'' سر کامران کے لہجے میں واقعی بے یقینی تھی۔ جاوید نے پہلی بار جواب دانستہ بہت ہلکے لہجے میں دیا تھا، اب گھبراہٹ میں جواب دہرایا تو بہت ضرور سے آواز نکل گئی۔ بہت سے لڑکے ہنس پڑے۔

''آپ کے والد کیا کام کرتے ہیں؟''

''جی وہ انکم ٹیکس آفیسر ہیں۔'' جاوید پچھلے دو تین سال میں کلرک کا ترجمہ آفیسر میں کر چکا تھا۔ افسری کی اپنی شان ہوتی ہے اور اس پہلو دار لفظ میں اتنی جہتیں ہیں کہ ان میں بہت سے قاصد، نائب قاصد، کلرک اپنی افادیت اور ہم سری کھوج لیتے ہیں۔ تعارف ختم ہوا تو سر کامران نے فزکس کے بہت سے سوالات پوچھے۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ کی ذہنی اپچ اور معلومات کا اندازہ ہو جائے تا کہ اسی سطح سے وہ آگے پڑھائیں۔ جاوید کے جوابات سے سب پر ظاہر ہو گیا کہ وہ کم از کم اس معاملے میں اپنے ہم سروں سے ممتاز ہے۔

آنے والے دنوں میں جاوید کی لیاقت کا سکّہ چل پڑا۔ اس کے ساتھیوں اور دوستوں کو اندازہ ہو گیا کہ کیوں کہ وہ گورنمنٹ اسکول سے یہ اونچائی طے کر کے گرامر میں آسکا ہے۔ جاوید کا گھر اسکول کے پاس ہی تھا۔ دو فرلانگ کا فاصلہ وہ آسانی سے پیدل طے کر لیتا۔ پیر کو بھی ایسا ہی ہوا۔ جاوید گھر کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ساجد نے اسے اپنی گاڑی میں چھوڑنے کی پیش کش کی۔ جاوید کا دل تو بہت چاہا مگر اس نے ساجد کو منع کر دیا۔

''یار قریب ہی تو ہے گھر...میں چلا جاؤں گا۔''

مگر ساجد پیچھے ہی پڑ گیا۔ ساجد بھی تعلیم میں بہت اچھا تھا اور جاوید سے خوب مقابلہ رہتا۔ دونوں بچوں میں باہمی احترام، رواداری اور دوستی کا وہی رشتہ قائم ہو رہا تھا جو کھلاڑیوں کی بھیڑ میں دو بہترین کھلاڑیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جاوید گاڑی سے اُتر کر گھر میں داخل ہوا تو اس کے ابا نے استقبال کیا۔ انہوں نے کھڑکی سے بیٹے کو آتے دیکھ لیا تھا۔

''بیٹا کس کے ساتھ آئے ہو؟''

''ابا وہ ساجد شیرازی ڈیفنس میں رہتا ہے۔ راستے میں مجھے چھوڑ گیا۔ میں نے تو بہت منع کیا تھا۔'' جاوید کا لہجہ مدافعانہ تھا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، دوستوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔'' ایک شیرازی صاحب کو تو میں بھی

UrduDost.com

جانتا ہوں ڈیفنس میں، کیا نام ہے اس کے والد کا؟''

''ابا شایدان کا نام امجد شیرازی ہے۔''

''ارے ہاں وہی تو، انکم ٹیکس میں کلکٹر ہیں۔ بیٹے ساجد سے مت کہنا، مگر امجد شیرازی تو کھا گئے ہیں ملک کو۔ انہوں نے تو رشوت میں سب کو مات کر دیا ہے۔ کروڑوں بنائے ہیں اس نے، مگر بیٹا کیا فائدہ ایسے پیسے کا۔ مجھے دیکھو، آج تک کبھی ایک پیسہ رشوت کا نہ لیا۔ ہمارے گھر میں خالی سائیکل ہے تو کیا۔ ان کی رشوت کی کار سے بہتر ہے۔ مجھے پتا ہے ہمارا گھر شایدان کے سرونٹ کوارٹر جتنا ہے مگر اس میں رشوت کا ایک پیسہ نہیں لگا۔'' ابا کے لہجے میں فخر تھا۔ ساجد کو ان کا قد بہت بڑا لگا۔ جیسے کسی اونچے استھان سے بیٹھے بھاشن دے رہے ہوں۔

''ارے کیا فائدہ اس حلال مال کا۔ دو پیسے اوپر سے لے لیتے تو آج گھر کا یہ حال نہ ہوتا۔''

اماں کی آواز ابا کو دھڑام سے واپس زمین پر لے آئی۔

جاوید کے لیے یہ کہانی نئی نہیں تھی۔ بچپن سے لڑکپن تک کتنے ہی مراحل ایسے آئے جب ابا بچوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکے۔ لیکن انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کو ہمیشہ اپنی ایمان داری کا احساس دلایا۔

''میں تم لوگوں کی نگہداشت میں ایک دھیلہ بھی رشوت کا شامل نہیں کر سکتا۔'' ابا کے اصول پکے اور اٹل تھے۔ اماں شروع میں تو ان پر ''آمنا صادقنا'' کہتی تھیں مگر اب پچھلے کئی سالوں سے انہیں شوہر کی ایمان داری کھلنے لگی تھی۔ خود ساجد کے چچا، ماموں، تایا ان سے معاشی طور پر آگے نکل گئے تھے۔ لیکن کسی خاموش معاہدے کے تحت ان کی آمدنی یا ذریعہ معاش کبھی گھر میں زیرِ بحث نہیں آتے تھے۔ ابا اور اماں کی جنگوں میں بھی کئی ایسے مقامات تھے جہاں دونوں کے پر جلتے تھے۔ یہ موضوع بھی اسی قسم کا ایک ممنوعہ علاقہ تھا۔

تین سال پہلے عید پر جاوید کے ماموں اپنے بچوں کے ساتھ عید منانے آ پہنچے تھے۔ جاوید اور اس کے بہن بھائی پچھلی عید کے کپڑوں میں گزارہ کرنے والے تھے لیکن ماموں کے آنے سے حالات بگڑ گئے۔ ماموں کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ اگرچہ ماموں پولیس میں سب انسپکٹر تھے لیکن ان کی آمدنی پہلے کبھی گھر میں زیرِ بحث نہیں آئی تھی۔ اب اپنے بھانجی، بھانجوں کے نئے کپڑے دیکھ کر اماں کا احساسِ محرومی دوچند ہو گیا۔

''کتنا برا لگ رہا ہے کہ ہمارے بچے پرانے کپڑے پہن رہے ہیں...عید پر بھی۔''



UrduDost Library

''جب تک تمھارا بھائی نہیں آیا تھا...اس وقت تک تو تمھیں اعتراض نہیں تھا؟'' ابا نے تنک کر پوچھا۔

''ہمارے بچوں کو احساسِ کمتری نہیں ہو رہا ہوگا؟'' اماں نے یاسیت سے سوال کیا۔

''حلال کی کمائی میں تو یہ ہی ہو سکتا ہے۔'' ابا کب ہتھیار ڈالنے والے تھے۔

''کیا مطلب ہے۔ میرے بھائی کی کمائی حرام کی ہے؟''

اماں کے تیور دیکھ کر ابا نے پسپائی اختیار کی۔

''اس سے بہتر تھا تم بھی گھر میں چار پیسے لے آتے تو بچے عید، بقرا عید پر نئے کپڑے تو پہن لیتے۔ کیا ملا ہے ہمیں اس ایمان داری سے۔'' اماں کا جارحانہ انداز بلا سبب نہیں تھا۔ وہ تو شکر ہے ماموں نے اعلان کیا کہ ان کی پچھلے ماہ ترقی ہوئی ہے، اس خوشی میں وہ اپنے بھانجے، بھانجی کے کپڑے بنوانا چاہتے ہیں۔ اماں کے کم زور احتجاج کو انہوں نے اپنے برادرانہ حقوق سے دبا دیا۔

چھ ماہی امتحان ہوا تو جاوید پہلے اور ساجد دوسرے نمبر پر آیا۔ اس سے پہلے سہ ماہی میں ساجد پہلے اور جاوید دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ ایک دفعہ جاوید، ساجد کے گھر بھی گیا۔ اس گھر کی چمک دمک، تراش خراش اور فرنیچر دیکھ کر اس کے ناپختہ ذہن میں عجیب عجیب خواہشات سر اُٹھانے لگیں۔ اب وہ ابا کو دیکھتا تو وہ اسے بہت بلند قامت نہیں بلکہ کم ہمت لگتے۔ ساجد، جاوید کے گھر آتا تو گاڑی میں بیٹھ کر ہی باتیں کرتا۔ نہ اس نے کبھی اندر آنے کی خواہش کی، نہ ہی جاوید نے اصرار کیا۔

سالانہ امتحان تک دونوں کی دوستی خاصی پختہ ہو چکی تھی۔ امتحان میں جاوید اوّل اور ساجد دوسرے نمبر پر رہا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ نتیجہ آنے کے بعد پرنسپل نے دونوں کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور شاباش دی۔ ''بیٹا گرامر ہائی اسکول میں جو بچے اوّل، دوم اور سوئم آتے ہیں، انہیں انجینئرنگ میں لندن میں خود بہ خود داخلہ ملتا ہے۔ اس کے لیے کالج آدھا خرچہ اسکالرشپ میں بھی اُٹھاتا ہے لیکن باقی آدھا خرچہ طالب علم کو خود اُٹھانا ہوتا ہے۔''

''سر کتنا خرچہ آئے گا'' ساجد نے بے نیازی سے پوچھا۔ جاوید کا دل بے وجہ دھڑکنے لگا۔

''چار سال کا خرچہ تقریباً پانچ لاکھ روپے ہے۔ مبارک ہو تم دونوں کو۔''

''نو پرابلم سر۔'' ساجد نے جواب دیا۔

جاوید کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی نتیجے کی خبر پہنچ چکی تھی۔

UrduDost.com

"شاباش بیٹا... جی خوش ہو گیا، آخر بیٹا کس کا ہے۔" ابا نے جاوید کو گلے لگا لیا۔ اماں نے بھی بلائیں لیں، نظر اُتاری۔

آج کھانے کی میز پر جاوید ہی جاوید تھا۔

"ابا مجھے لندن میں انجینئرنگ کالج میں داخلہ ملا ہے اور وہ آدھا خرچہ بھی اُٹھائیں گے۔" جاوید نے بم کا دھماکا کیا۔

"واقعی بھیا، زبردست۔" جاوید کی بہن کی خوشی دیدنی تھی۔

"بیٹا باقی آدھا خرچہ کتنا ہے۔" ابا نے مدھم لہجے میں دریافت کیا۔

"ابا پانچ لاکھ، لیکن چار سالوں میں ابا۔"

"پانچ لاکھ۔" ابا کا منہ جیسے بند ہونا بھول گیا۔

"بیٹا یہ تو ہماری استطاعت سے باہر ہے۔"

"لیکن ابا ساجد تو جا رہا ہے۔" جاوید روہانسا ہو گیا۔

"تمہیں معلوم ہے امجد شیرازی کے پاس سب رشوت کا پیسہ ہے۔"

"تو ابا آپ بھی لے لیتے رشوت۔" جاوید نے گویا بم کا گولہ داغ دیا۔

"کیا فائدہ اس دیانت داری کا۔ میں نے اتنی محنت کی اب پھل ملنے کا وقت آیا تو خاک دیانت کا پھل کھاؤں۔" جاوید کا یہ روپ پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جاوید کی بہن اور ماں بھی ابا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن بیٹے۔" ابا نے احتجاج کیا۔

"لیکن ویکن کیا ابا، کیا ملا ہے ہم کو اس سے زندگی بھر۔"

"آپ کے غلط فیصلوں کے نتائج ہم سب کو بھگتنے پڑتے ہیں۔" اماں نے لقمہ دیا۔

"یہ فیصلے غلط تھے یا صحیح، اس کا فیصلہ شاید میں یا تم نہ کر سکیں۔ شاید کوئی بھی نہ کر سکے۔" ابا کا جملہ فضا میں معلق رہ گیا کہ جاوید تو کرسی پٹخ کر باہر جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆



UrduDost Library

# گنوارن

نصیرہ بانجھ نہیں تھی۔

بانجھ تو دور کی بات، نصیرہ نے تو شادی کے چند ماہ بعد ہی جب ساس کے استفسار پر منہ پر دوپٹا رکھ لیا تھا تو گھر میں خوشی کے شادیانے بج گئے تھے اور پھر سال پورا ہونے سے پہلے ہی اس نے پورے آٹھ پونڈ کا بچہ جنم دے کے اپنے تئیں اپنا کھوٹا مضبوط کر لیا تھا۔

وہ بدصورت بھی نہیں تھی۔ خیر آپ اسے حسین تو نہیں کہہ سکتے مگر ہاں کھلتا ہوا رنگ، سیاہ کالے گھنیرے بال، اُٹھتا ہوا قد اور بھرے بھرے جسم کے ساتھ مورنی جیسی چال، کوئی وجہ تو تھی کہ حامد کی ماں نے نصیرہ کا ہاتھ مانگا تھا۔

نصیرہ لڑاکا بالکل نہیں تھی بلکہ سچ پوچھیں تو اس کے وجود کا سب سے خوب صورت آہنگ، اس کا میل ملاپ اور رویہ تھا۔ ہر ایک سے ہنس کے بات کرنا، دوسروں کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانا، شادی کے فوراً بعد ہی گھر کا سارا کام ایسے سنبھال لیا تھا کہ شوہر سے زیادہ ساس کی دلاری تھی۔

مگر نصیرہ تھوڑی گنوار تھی۔ اسے شوخ بھڑکیلے رنگ کے کپڑے بہت پسند تھے۔ میک اپ بھی ضرورت سے کچھ زیادہ تھوپنے کی عادت اور وہ زیور کس کام کا جس کی نمائش نہ کی جائے، اس پر طرہ یہ کہ انگریزی سے بالکل نابلد۔ پنڈ کی ایک عام سی خوش شکل، خوش مزاج لڑکی، پانچویں جماعت تک پڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب اس کا عم زاد بہاول پور سے ڈاکٹری کر کے پنڈ واپس آیا۔ خالد یوں تو نصیرہ کا عم زاد تھا مگر لڑکا ہونے کے ناتے اس کی تعلیم اور تربیت کو ہر چیز پر فوقیت دی گئی تھی۔ شہر میں رہ کر خالد کے انداز بھی شہری ہو گئے تھے۔ خواہ وہ بال بنانے کا انداز ہو یا اس کے پمپی جوتے۔ ہر رخ سے واضح تھا کہ اب یہ پتھر جگہ چھوڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر بن جانے کے باوجود خالد نے اپنوں کی محبتوں اور رشتہ داریوں سے ناتا جوڑ رکھا تھا۔ یہ وہ وقت تھا

UrduDost.com

کہ امریکہ میں ڈاکٹروں کی سخت کمی تھی اور ایک ذرا سا امتحان پاس کرنے سے امریکہ میں بہت اچھی نوکری مل جاتی۔ ساٹھ کی دہائی کا قصہ ہے۔ اس وقت تک پنڈ سے کوئی امریکہ تو کیا۔ جہاز میں بھی نہیں بیٹھا تھا۔ ایسے میں خالد نے پنڈ آ کر والدین سے امریکہ جانے کی اجازت کیا مانگی... گاؤں کی پُرسکون زندگی میں بھونچال آ گیا۔

خالد کے والدین نے ایسے بہت قصے سن رکھے تھے کہ یہ بھولے بھالے مسلمان لڑکے امریکہ جاتے ہیں تو وہاں کی آزاد خیال، آوارہ منش گوری لڑکیاں ایسا جال بچھاتی ہیں کہ گویا کوئی کیڑا مکڑی کے جالے میں پھنس جائے۔ نہ بابا لڑکا بالکل ہاتھ سے جائے گا۔ ساری نسل خراب ہو گی۔ ماں نے رو رو کے برا حال کر لیا۔ دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دی۔ باپ نے بات چیت ترک کر دی اور بیمار سا رہنے لگا۔ ادھر خالد کو امریکہ میں ترقی اور پیشے کے سہانے خواب آ رہے تھے۔ اُدھر اس کے والدین کو اپنا سپوت ہاتھ سے جاتا نظر آ رہا تھا۔ جب معاملہ کسی صورت نہ سلجھا اور دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر ڈٹ گئے تو تایا نے اس کا حل یہ نکالا کہ خالد امریکہ تو چلا جائے لیکن پہلے شادی کر کے اور اپنی نئی نویلی دلہن کو ساتھ لے جائے۔ جب گھر میں چاندنی چٹکی ہو گی تو باہر کی روشنی کیوں دیکھے گا۔ شومئی قسمت زیادہ دور نہیں کھنگالنا پڑا اور قرعہ کا فال نصیرہ کے نام نکل آیا۔ نصیرہ سے اس کی راضی پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خالد نے یہ سوچ کر ہاں کر دی کہ امریکہ جا کر نصیرہ کو اپنے رنگ میں رنگ لے گا۔

شادی کے بعد چند دن گزار کے خالد اور نصیرہ امریکہ چلے گئے۔ شروع کے تین چار مہینے تو اچھے گزر گئے۔ خالد کا کوئی ایسا جاننے والا بھی نہیں تھا، ہسپتال سے فارغ ہو کے زیادہ وقت گھر میں گزارتا۔ گھر پہنچتا تو نصیرہ نے اس کی پسند کی کوئی چیز پکائی ہوتی۔ خالد کے کپڑے دھونا، استری کرنا، وقت پر گھر کا پکا پکایا کھانا مل جاتا، خالد مست تھا۔

رفتہ رفتہ خالد کے دوست بننے شروع ہو گئے۔ تقریباً سب ہی پاکستانی تھے، ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوا تو نصیرہ کا بھی دل لگنا شروع ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس حلقے کی زیادہ تر بیگمات پڑھی لکھی اور شہری خواتین تھیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ یا لباس خراش، اُٹھنا بیٹھنا نصیرہ کے لیے اجنبی تھا۔ اکثر کہیں جانے کے لیے نصیرہ تیار ہوتی تو خالد اس سے دوسرا لباس پہننے کو کہتا۔ نصیرہ سمجھ نہیں پائی کہ ایسے اچھے ریشمی شوخ رنگوں کے کپڑوں کو چھوڑ کر پارٹی میں یہ بغیر کام کا سادے لباس پہننے کی کیا تک ہے۔ لیکن اس نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔ جو خالد نے کہا، وہی پہن لیا۔ پھر



UrduDost Library

ایک دن خالد کی فرمائش پر اپنے کولہوں تک آنے والے بالوں کو کٹوا کر شانوں تک کر لیا۔

"اتنے چھوٹے بال" اس نے بہت دکھ سے خالد سے سوال کیا۔

"ہاں ذرا دیکھو اب کتنی اسمارٹ لگ رہی ہو" اس قربانی کے بعد بھی عجب روکھا اور بے رخی سے جواب دیا گیا۔

"روکھا پن اور بے رخی اب اکثر کا معمول بنتی جا رہی تھی۔

"تمہیں میں نے انگریزی کلاسوں میں بھی داخل کرایا تھا مگر تم وہی گنوار رہیں، جٹ بالکل" خالد نے طنز سے تیر بسایا۔

"کیا کروں، وہاں جو پڑھاتے ہیں بالکل مجھے سمجھ نہیں پڑتا" نصیرہ نے روہانسا سی ہو کر جواب دیا۔

"خدا کے لیے تم سب کے سامنے انگریزی بولنے کی کوشش نہ کیا کرو اور بے عزتی ہوتی ہے۔ منہ بند رکھتی ہو تو کم از کم کسی کو پتا تو نہیں چلتا۔ منہ کھولتے ہی پتا چل جاتا ہے کہ کیسی گنوار ہے۔" خالد بالکل منہ پھٹ اور بدلحاظ ہوتا جا رہا تھا۔

"مگر وہ اسکول والے کہتے ہیں آپس میں انگریزی بولنے کی کوشش کیا کرو۔" نصیرہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"کوشش کیا کرو" خالد نے نصیرہ کی آواز میں اس کی نقل اُتاری۔ "اور شوہر کی بے عزتی کیا کرو" خالد گاڑی نکال کے کہیں نکل گیا۔ اب ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔ شام کے وقت خالد اکیلا کہیں غائب ہو جاتا۔

نصیرہ کو لگا کہ اب خالد ایک دوسری عورت کے ساتھ وقت گزارنے لگا ہے۔ تنہائی میں آنسو بہانے کے علاوہ اس نے خالد سے کوئی شکایت نہیں کی۔ "بچہ ہو جائے گا تو آپ ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ کیا کروں میں ہوں بھی تو ایسی گنوار" نصیرہ نے دکھ سے سوچا۔

"نصیرہ یاد ہے شادی کی رات تم نے کہا تھا آپ ساری زندگی جو بھی مانگیں گے میں خوشی سے دوں گی۔" خالد ایک دو دن سے دوبارہ وہی پرانا خالد نظر آ رہا تھا۔ دونوں رات کا کھانا کھا کے ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔

"ہاں کہا تو تھا۔ کبھی میں نے خدمت میں کمی کی ہے آپ کی۔" نصیرہ کا دل اَن جانے خدشات سے لرز رہا تھا۔

"سوچ لو۔ ایسے ہی وعدہ تو سب کرتے ہیں پر جب قربانی دینی پڑے تو بہانے یاد آنے لگتے ہیں۔" خالد موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

"آپ مانگ کے دیکھیں...جان بھی حاضر ہے۔" نصیرہ اب بھی خوش فہمی میں مبتلا تھی۔

"بھئی میں دوسری شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔ اگلے ہفتے نکاح ہے۔ سلمٰی میرے ساتھ باہر پارٹیوں وغیرہ میں جا سکے گی۔ میری کلینک اور اسپتال میں بھی تم بالکل فٹ نہیں ہوتی ہو۔ لیکن تم تو میرے دل کی رانی ہو اور رہو گی۔ یہ تو صرف اوپر کے دکھاوے کی شادی ہوگی۔" خالد تیز تیز بولے جا رہا تھا۔

نصیرہ جواب دینا بھی چاہتی تو شاید اس کی آواز ساتھ نہیں دیتی۔ وہ بس ٹک ٹک خالد کو تکتی رہی۔ ایک دو جاننے والیوں نے بہت کہا کہ وہ اپنے گھر خط لکھے، خالد کے والدین کو درمیان میں لائے یا سلمٰی سے خود بات کرے مگر نصیرہ جیسے اپنے خول میں بند ہو گئی تھی۔ اس نے اور زیادہ تندہی سے خالد کی خدمت اور گھر کے کام شروع کر دیے۔ ایک سہیلی نے ایک دن زبردستی سلمٰی کا فون ملا دیا۔ نصیرہ کی آواز سن کے سلمٰی نے انتہائی رکھائی سے فون بند کر دیا۔ نصیرہ کا یہ احتجاج بھی ختم ہو گیا۔

سال گزرنے سے پہلے نصیرہ کے ہاں سوکن آ چکی تھی۔ بچہ ہونے کے چند ماہ بعد خالد اور نصیرہ دسمبر کی چھٹیوں میں پنڈ آ گئے۔ خالد نے راستے ہی میں منت سماجت شروع کر دی تھی کہ اس کے ماں باپ کو دوسری شادی کے متعلق نہ بتایا جائے۔ نصیرہ کے وعدے یاد دلائے۔ اپنی جان کی قسمیں دیں۔ دوست، رشتہ دار سب خالد اور نصیرہ کو دیکھ کے نہال ہو گئے۔

نصیرہ اور خالد دونوں کی ماؤں نے تاڑ لیا کہ معاملہ وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ دونوں نے بہت زور ڈالا، قسمیں دیں مگر نصیرہ یہی کہتی رہی کہ سب ٹھیک ہے۔ خالد نے ذکر چھیڑا کہ نصیرہ کو پنڈ میں ہی چھوڑ دے۔ کبھی وہ خود آ جایا کرے گا کبھی نصیرہ آ جائے۔ اس سے یہ کہ بچے کی اچھی تربیت ہو جائے گی، ورنہ وہاں امریکہ میں بگڑ جائے گا۔ ماں اور ساس دونوں جہاں دیدہ تھیں۔ اڑ گئیں کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...آئندہ ایسا ذکر بھی نہ آئے۔

امریکہ واپس آ کر خالد کا رویہ نصیرہ سے بہت خراب ہو گیا۔ اب سلمٰی انہیں کے گھر میں آ گئی تھی۔ سلمٰی کے خود اپنے پہلے شوہر سے دو بچے تھے۔ نصیرہ ان کا بھی ایسے خیال رکھتی جیسے اس کے اپنے بچے ہوں۔ خالد اور نصیرہ اس کے بعد پانچ سال تک پاکستان نہیں گئے۔ خالد کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بھائی کے بہت فون آئے کہ آخری وقت آ کے والدین سے مل جاؤ مگر





خالد کام کا بہانہ کر کے نہ گیا۔

سلمٰی کا جادو جو تین چار سال خوب سر چڑھ کر بول رہا تھا، اب آہستہ آہستہ دم توڑ رہا تھا۔ جیسے جیسے خالد کی دلچسپی سلمٰی میں کم ہو رہی تھی۔ سلمٰی کا رویہ نصیرہ سے بہتر ہوتا جا رہا تھا۔

کئی سال بعد اچانک خالد کو نجانے کیا سوجھی کہ پھر پاکستان کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے والدین تو زندہ تھے نہیں۔ خالد اور نصیرہ اس دفعہ نصیرہ کے بھائی کے ہاں اُترے۔ ایک دو دن تو ایسے ہی لپوشپو میں گزرے۔ پھر خالد نے اعلان کیا کہ وہ امریکہ واپس جا رہا ہے۔ نصیرہ کے بغیر بچے کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے کیوں کہ وہاں اس کی تعلیم شروع ہو چکی ہے اور اس میں حرج ہوگا۔ نصیرہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے اپنی امنگوں اور محبتوں کے سب ناتے اب اپنے لڑکے سے جوڑ رکھے تھے۔ بہت روئی، خالد کے آگے ہاتھ جوڑے، رشتہ داروں نے بھی بہت سمجھایا مگر خالد نے ایک نہ مانی۔

اب نصیرہ نے بھائی کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ عجیب عورت تھی۔ خود گلہ شکوہ کر لیتی مگر کسی اور کے منہ سے خالد کی برائی برداشت نہ کرتی۔ اکثر اس بات پر بھاوج سے جھگڑا بھی رہتا۔ جہاں تک ہو سکے کڑھائی سلائی کے ذریعے اپنا گزارا کرتی۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا مگر راتوں کو بیٹے کی یاد بہت ستاتی۔ اگلے دس سالوں میں خالد نے پاکستان کے چار پانچ چکر لگائے۔ ہر دفعہ بیٹے کو بھی ساتھ لے کر آیا۔ وہ دو ہفتے گویا نصیرہ کے لیے سرمایۂ حیات ہوتے۔ قدرت کے کھیل دیکھیے کہ نصیرہ کا بیٹا بھی ماں سے بہت مانوس رہا۔ دونوں کے درمیان ایک ناتا سا بندھا رہا جس کو میلوں کی جدائی کبھی نہ توڑ سکی۔

"اماں اب ڈیڈی نے چھوٹی امی کو چھوڑ دیا ہے۔" نصیرہ کے بیٹے نے دھماکا کیا۔

"اچھا....واقعی" نصیرہ ایک دم خوش ہو گئی۔

"اماں ڈیڈی اب اکثر اپنی سیکریٹری کے ساتھ گھومتے ہیں۔ چھوٹی امی سے بہت جھگڑے ہوتے ہیں۔" نصیرہ کے بیٹے نے امیدوں کے چراغ بجھا دیے۔

پھر اطلاع آئی کہ خالد نے اپنی سیکرٹری سے بیاہ رچا لیا ہے اور اس کے ساتھ رہنے لگا ہے۔ سلمٰی اب اپنے گھر میں اپنے پہلے شوہر کی اولادوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ نصیرہ کا بیٹا امریکہ میں اسکول سے نکل کر کالج پہنچ گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹوں کی ایک منٹ نہیں بنتی تھی۔ وہ اکثر سپر مارکیٹ میں کام کر کے اور اخبار بیچ کر گزارا کرتا اور کبھی کبھار تو نصیرہ کو کچھ پیسے بھی بھیج دیتا۔

UrduDost.com

''اماں میرا میڈیکل اسکول میں داخلہ ہو گیا ہے۔'' بیٹے کا فون سن کر نصیرہ کا سیروں خون بڑھ گیا۔

''اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ میں وہاں رہتی تو شاید یہ اتنا آگے نہ بڑھتا۔'' نصیرہ نے سوچا۔

''تیرے ڈیڈی کے کیا حال ہیں بیٹا۔'' نصیرہ کے لہجے کا اشتیاق بیٹے کو غصہ دلا گیا۔

''اماں آپ ابھی تک ان کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ کس قسم کی عورت ہیں... آپ'' بیٹے نے غصے سے سوال کیا۔

''بس بیٹا! پھر بھی بتا تو سہی، کچھ قصے تو سنا ان کے۔'' نصیرہ وہ پرانی نصیرہ بن جاتی تھی۔

''اماں میں نہ ان سے ملتا ہوں نہ ملنا چاہتا ہوں۔'' بیٹے نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

بیٹے کے کالج میں داخلے کی خوشی نصیرہ کو راس نہ آئی اور وہ شدید بیمار ہو گئی۔ شدید یرقان میں جان کے لالے پڑ گئے مگر بھائی کو قسمیں دیں کہ بیٹے کو نہ بتانا، ورنہ اس کی پڑھائی میں حرج ہوگا۔ مرض بڑھتا گیا اور نصیرہ پر غشی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ بھائی نے نصیرہ کے بیٹے کو فون کر دیا کہ آ کر دیکھ جا۔ وہ نیک بخت پڑھائی چھوڑ کر پاکستان چلا آیا اور ماں کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اپنی جمع پونجیں ساتھ لایا تھا۔ نصیرہ کو ایک اچھے ہسپتال میں داخل کرایا۔ دھیرے دھیرے نصیرہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔

''اس سے اچھا تھا میں مر ہی جاتی۔ تیرا تو مستقبل خاک ہو گیا۔''

''نہیں اماں... آپ ٹھیک ہوجاؤں، پھر کالج جاؤں گا۔''

''اب بیٹا بائیس برس کا ہو گیا تھا۔ اس دفعہ آنے سے پہلے اس نے نصیرہ کے لیے گرین کارڈ کی درخواست ڈال دی تھی۔ گرین کارڈ اس کی موجودگی میں ہی آ گیا۔

''اماں اب میرے ساتھ امریکہ چلو۔'' اس نے گرین کارڈ ماں کی گود میں ڈالا۔ نصیرہ بالکل خاموش ہو گئی۔ ایسا ہو جائے گا یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ بیٹے کا خیال تھا کہ شاید نصیرہ جانے سے انکار کرے گی مگر نصیرہ بہت آسانی سے مان گئی۔ بلکہ اس کے حوصلوں میں پھر ایک جان سی پڑ گئی۔ دل کے کسی گوشے میں کچھ امنگیں پھر سر اُٹھانے لگیں۔ نصیرہ نے اپنی پوری شعوری کوشش سے انہیں دبائے رکھا۔

اب نصیرہ اپنے بیٹے کے ساتھ امریکہ آ گئی۔ بیٹا دوبارہ میڈیکل اسکول جانے لگا۔ نصیرہ



UrduDost Library

اس کے پیچھے اپارٹمنٹ کو چمکا کے رکھتی۔ شام بیٹا آتا تو گرم کھانا اور ماں کی محبت تیار ملتی۔

''بیٹا تیرے ڈیڈی کے کیا حال ہیں۔'' نصیرہ نے چاول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ نظریں پلیٹ پر ہی تھیں۔ بیٹے کی طرف دیکھنے سے انکاری، اسے پتا تھا کہ بیٹا اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھ رہا ہے۔

''ماں میں نے کتنی دفعہ کہا ہے، اس کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو۔'' آج بیٹا بہت گستاخ ہو بیٹھا تھا۔

''پتا ہے... اب انہوں نے سیکریٹری کو چھوڑ کے اس کی چھوٹی بہن سے شادی کر لی ہے۔'' بیٹے کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ہائے ربّا'' ایک لمحے کے لیے تو نصیرہ کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا۔ ''کیسا مرد ہے'' اس نے دل میں سوچا۔

''سیکریٹری فون پر رو رہی تھی کہ تمہارا باپ ہے تم سمجھاؤ۔ بڑی بہن کو چھوڑ کے اب چھوٹی کے پیچھے ہیں۔ بیٹے کھانا ادھورا چھوڑ کے میز سے اُٹھ گیا۔

کچھ دن اپارٹمنٹ کے ماحول میں تناؤ سا رہا۔ ایک دن بیٹے کی غیر موجودگی میں دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے سلمیٰ کھڑی تھی۔ نصیرہ نے سوچا دروازہ بند کر دے، بلاوجہ بیٹا ناراض ہوگا مگر سلمیٰ اس کا ارادہ بھانپ کے اندر آ گئی۔ نصیرہ سے لپٹ کے روئی، اپنے کیے کی معافی چاہی۔

''اب اس نے تیسری کیا... چوتھی شادی رچا لی ہے تو مجھے معلوم ہوا ہے میں نے تیرے ساتھ کیا ظلم کیا تھا۔'' سلمیٰ روئے جاتی تھی۔ بیٹے کے آنے تک نصیرہ سلمیٰ کو معاف کر چکی تھی۔ دونوں باورچی خانے میں ایسے کھانا بنا رہی تھیں جیسے کہ پرانی سہیلیاں ہوں۔ نصیرہ کے بیٹے کو میڈیکل اسکول سے نکلے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ اسے ایک لڑکی پسند آ گئی۔ لڑکی نصیرہ کو بھی پسند آئی۔ ''بالکل ٹھیک ہے میرے بیٹے کے لیے۔'' اس نے سلمیٰ کو بتایا۔ شادی کی کسی تقریب میں بھی بیٹا خالد کو بلانے پر تیار نہیں تھا مگر نصیرہ اڑ گئی۔ باپ ہے تیرا، کیسا بھی ہو، باپ ہے تیرا، نصیرہ نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔ سلمیٰ نے بیٹے کا ساتھ دینا چاہا تو نصیرہ نے اسے ایسے گھورا کہ وہ چپ ہی رہ گئی۔

''یہاں آ کے وہ پھر کوئی گل کھلائیں گے۔'' بیٹے نے احتجاج کیا۔ ''میرے ساتھ اس کی بھی پانچویں شادی نہ ہو رہی ہو۔''

''نہیں بیٹا... اچھا سوچتے ہیں۔'' نصیرہ کا لہجہ پُرسکون تھا۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں، مہندی پر بلا لیتے ہیں۔ اگر کوئی گڑبڑ نہیں کی تو شادی پر بلا لینا۔"
سلمٰی نے رائے دی۔

مہندی کا فنکشن اب شادی سے زیادہ جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بننے کے بعد اب نصیرہ اور اس کا بیٹا ایک بڑے گھر میں بس گئے تھے۔ مہندی گھر میں ہی رکھی گئی تھی۔ بیٹا صبح سے دوڑ دھوپ میں مشغول تھا۔ باپ نے دوپہر میں آنا تھا۔ مہندی شام میں تھی۔ سلمٰی نے مہندی میں شریک ہونے سے انکار کردیا تھا۔ "جس جگہ یہ آدمی ہو، میں وہاں نہیں ہوسکتی۔"

"ارے شوہر ہے تیرا۔" نصیرہ پتا نہیں طنز کر رہی تھی یا ایسی ہی اللہ والی تھی۔

"شوہر... میری جوتی ہے۔ ہر تین چار سال بعد ایک عورت چھوڑ دیتا ہے اور نئی شادی رچا لیتا ہے۔" سلمٰی یہ کہہ کر اپنے بیٹے کے ہاں چل دی۔ وہ خالد کا سامنا کرنے کو بالکل تیار نہیں تھی۔ نصیرہ بھی آج تقریباً پندرہ برس کے بعد خالد کو دیکھتی۔

"آج تمہارے بیٹے کی مہندی ہے۔ خدا کے لیے ذرا اچھی طرح تیار ہونا۔" سلمٰی نے جانے سے پہلے ہدایت کی نصیرہ نے سلمٰی کی یہ بات شاید پلے سے باندھ لی۔ خوب دل لگا کر تیاری ہوئی۔ سرخ پھولوں کی شلوار قمیض زیب تن کی، بالوں کو کریم لگا کر سلیقے سے سجایا، میک اپ کر کے اِدھر سے اُدھر مصروف پھر رہی تھی۔ بیٹا اپنے کمرے میں تیار ہورہا تھا۔ تقریباً 3 بجے دروازے پر گھنٹی بجی۔ نصیرہ دروازے کے آس پاس ہی منڈلا رہی تھی۔ بیٹے کے آنے سے پہلے ہی دروازہ کھول چکی تھی۔

"اوہو بھئی... کیا بات ہے۔" خالد نے اس کے بناؤ سنگھار پر ایسے فقرہ کسا... جیسے ابھی صبح ہی مل کر گیا ہو اور نصیرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

نصیرہ نے شرما کے پلو منہ پر رکھ لیا۔ "آپ بھی نہ بس... ذرا نہیں بدلے۔"

بیٹا جو کمرے کے دروازے سے دیکھ رہا تھا، تپ گیا۔ آگے بڑھ کر ماں کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ماں تمہیں اس شخص سے نفرت ہونی چاہیے... نفرت، آخر کیا چیز ہو تم"

"گنوارن ہوں... بیٹا گنوارن۔" نصیرہ کے چہرے پر چاندنی بکھری تھی، لہجے میں وہی سکون دبا تھا جو سمندر کی لہروں کے شور کے باوجود کنارے پر محسوس ہوتا ہے۔





# دلدل

"لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم"

میں بھی لہک لہک کے گلوکارہ کا ساتھ دے رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر دونوں بھانجیاں، ندا اور سمیرا، ایک دوسرے کو کہنیاں مار کے مسکرا رہی تھیں۔ دونوں معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتیں اور پھر ایک دوسرے کو۔ ندا نے شاید ایک دو مرتبہ اپنے دیدوں کو چھت کی طرف گھما کے بھی دیکھا۔ یہ میرا کراچی میں پہلا دن تھا۔ اسی طرح دونوں مجھے طرح دے رہی تھیں۔ ورنہ اب تک یا تو احتجاجاً گانے کو توڑ مروڑ کے گانے لگتیں یا ملتجی ہوتیں۔

"ماموں خدا کے لیے بس کریں، اس کیسٹ کی نقل آپ کو دے دیں گے، نیویارک جا کر سن لیجیے گا۔"

یا یہ کہ

"ابو کیا کم تھے جو آپ نے رہی سہی کسر پوری کردی۔"

ایسا نہیں کہ دونوں کو موسیقی سے بیر تھا۔ بس یہ کہ عمروں کا تفاوت اور لے کا دھیما پن، ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ عمر کے مختلف ادوار میں ایک ہی انسان کو اتنی مختلف قسم کا سُر اور لَے پسند آتی ہیں کہ شاید کسی کی پسندیدہ دھن سے آپ صاحبِ معاملہ کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں پچھلے بیس برس سے نیویارک میں مقیم ہوں۔ ہر دو سال کے بعد کراچی کا چکر ضرور لگا لیتا ہوں۔ نجانے مٹی میں وہ کون سی کشش، خوشبو یا خاصیت ہے کہ کتنی ہی دہائیاں گزر جانے کے بعد

بھی جانے والوں کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔

''بھئی! ندا کو آج کالج سے کون لائے گا؟'' تولیے سے سر کے بال رگڑتے ہوئے میرا بہنوئی ناشتے کے کمرے میں داخل ہوا۔ جاوید ایک مقامی بینک میں منیجر تھا۔ گھر میں ایک ہی گاڑی تھی۔ وہ عموماً واپسی میں کالج سے ندا کو لیتا آتا۔ صبح دونوں بہنیں ایک سوزوکی وین میں جاتیں۔ سمیرا ابھی نویں جماعت میں تھی جب کہ ندا کالج کے آخری سال میں تھی۔

''ابو میں خود سے رکشہ کر کے آ جاؤں گی۔'' ندا نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

''نہیں بیٹا مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں۔ ہمارے بینک میں آڈیٹر آئے ہوئے ہیں اور مجھے واپسی میں دیر سویر ہو سکتی ہے۔'' جاوید ذرا متفکر تھا۔

''بھئی تم لوگ فکر نہیں کرو، ندا کو میں لے لوں گا۔'' ویسے بھی مجھے یہاں آئے دو دن ہو گئے ہیں اور تم لوگوں نے اب تک مجھے باہر نہیں نکلنے دیا۔ گھر گھسا بنا رکھا ہے۔'' میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''چلو یہ ٹھیک ہے''۔ جاوید کو اطمینان ہوا، اور وہ اپنے کمرے میں تیار ہونے چل دیا۔

''ماموں ذرا سنبھل کے۔ گیٹ کے آس پاس بہت سے ہیرو منڈلا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی پولیس والا آپ کو بھی تاڑو سمجھ کے گھیر نہ لے۔'' ندا نے شرارت سے مجھے چھیڑا۔ باہر سے سوزوکی کا ہارن بجا تو دونوں بچیوں نے مجھ پر سے سوئی ہٹائی۔

سارا دن بہن سے باتوں میں گزر گیا۔ شام کو جینز اور سفید شرٹ پہن کے میں چار بجے ندا کو لانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جاوید میرے جینز کے پہناوے سے عاجز رہتا۔ ''یار یہاں آیا کرو تو ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہنا کرو۔ لوگوں کو ذرا لگے تو کہ امریکہ سے آئے ہو۔ ہماری بھی شو شار ہے۔''

جاوید جینز تو امریکہ کے صدر سے لے کر بل گیٹس تک پہنتا ہے۔ اس میں کیا خرابی ہے؟''

پچھلے سال کا یہ مکالمہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔

''یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ کم از کم لباس سے آدمی کچھ رعب دار تو لگے۔'' جاوید اڑا رہا۔

''چلو تم سب سے کہہ دیا کرو۔ امریکہ سے آئے ہیں مگر ان کے کپڑوں کا سوٹ کیس کھو گیا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اس وقت جاوید کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر جینز چڑھائی اور ندا کو لینے کالج جا پہنچا۔

کالج کے گیٹ کے باہر آڑھی ترچھی گاڑیاں ہر رخ پر جمع تھیں۔ میں بھی کار سے نکل کر کھڑا





ہو گیا کہ اس تماشے سے لطف لے سکوں۔ لڑکیوں کے غول در غول گیٹ سے نکل رہے تھے۔ دمکتے، مسکراتے چہرے سارا دن گزارنے کے باوجود بھی چہروں پر تھکن کی کلفت نہیں۔ جوانی بھی عمر کا عجیب حصہ ہے۔ چہروں پر اُمید کے دیے روشن رہتے ہیں۔ جیسے انہیں آنے والے کل کے اچھا ہونے کا یقین ہو۔ آپ جتنا زیادہ متمول، پُر امن اور پُر سکون ملک میں جائیں گے چہروں پر دمکتی یہ کرنیں اور زیادہ واضح ہو جائیں گی۔

پچھلے چند سالوں سے مجھے کراچی میں نوجوانوں کے چہرے پژمردہ یا پراگندہ، پریشان اور مایوس نظر آتے ہیں۔ یہ نوجوان چہرے معاشرے کے انتشار، افراتفری اور مالی بدحالی کا آئینہ ہیں۔ خیر بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں آپ کو ندا کے کالج کا قصہ سنا رہا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اکثر نوجوان بجائے اپنی گاڑیوں میں اپنی سواری کا انتظار کرنے کے، یا تو گاڑی سے باہر نکل کر کھڑے تھے یا گیٹ کے سامنے جمع تھے۔ ندا باہر نکلی تو دائیں بائیں دیکھا، جیسے مجھے ڈھونڈ رہی ہو۔ ایسے میں مجھے لگا، جیسے اس کے پاس کھڑے ایک نوجوان نے اس سے کچھ کہا ہو۔ ندا نے پلٹ کر اسے کچھ جواب دیا۔ اسی وقت میں ایک قدم آگے بڑھا اور ہاتھ ہلایا تو ندا نے مجھے دیکھ لیا اور تیز تیز قدموں سے گاڑی میں آ بیٹھی۔

''ماموں میں اس شرط پر بیٹھی ہوں کہ میری مرضی کی موسیقی بجے گی۔'' ندا نے شرط عائد کی۔

''بھئی یہ کچرا تو تم روز سنتی ہو۔ جب تک میں یہاں ہوں کچھ ایسی موسیقی سن لو جس سے روح کو بالیدگی ملے'' میں نے اسے چھیڑا۔

''کچرا، یہ کچرا ہے؟'' ندا نے برا مان کے کہا۔

''اور کیا ہے؟ ستم یہ ہے کہ ہزاروں میل دور نیویارک میں بھی زیادہ تر یہی خرافات موسیقی کے نام سے سننے کو ملتی ہیں۔ یہاں آ کے بھی وہی کان پکنے کا سامان ہے۔ لگتا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی اب MTV کا نام سے حملہ آور ہوئی ہے۔'' میں نے گلہ کیا۔

''ندا وہ گیٹ کے باہر کون لڑکا تھا۔ تم سے کچھ کہہ رہا تھا'' کچھ دیر کے بعد میں نے ندا سے دریافت کیا۔

''کون سا لڑکا۔ وہاں تو اتنے سارے لڑکے جمع رہتے ہیں۔ آپ کو ایسے ہی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' ندا کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرا تجسس بڑھ گیا۔ جواب سے زیادہ جواب کا انداز اہم تھا۔

"ندا تمہیں پتا ہے... جب آدمی کوئی بات کرتا ہے تو صرف گفتگو کا پچاس فی صد مطلب اس کے الفاظ میں پوشیدہ ہوتا ہے جب کہ باقی آدھا مفہوم اس کے چہرے کے تاثرات ہاتھوں کی حرکت، منہ کہ اس کے جسم کی گفتگو میں چھپا ہوتا ہے۔ میں نے فلسفہ جھاڑا۔

"کیا مطلب؟" وہ انجان بنی رہی۔

"مطلب تمہیں معلوم ہے۔" میں چاہ رہا تھا وہ اپنی غلط بیانی خود قبول لے۔

"چھوڑیں ماموں، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایسے خود ساختہ ہیرو تو یہاں روز جمع رہتے ہیں۔" ندا نے بالواسطہ گویا اپنی غلط بیانی کا اقرار کرلیا۔

"بھئی! میرا تو خیال تھا کہ میں نے اپنے بچوں سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رکھے ہیں اور ہم ہر موضوع پر حدود میں رہ کر گفتگو کر سکتے ہیں۔" میں نے شکوہ کیا۔

"ماموں آپ بھی بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ بھئی وہ لڑکا میرا نمبر مانگ رہا تھا۔ کئی دفعہ مانگ چکا ہے۔ شکر ہے اب تک ابو کی نظر نہیں پہنچی۔" اب ندا نے بات صاف کر دی۔

"ہاں بیٹا بہتر یہی ہے کہ اسے نظر انداز کرو۔ ایک دو دفعہ میں مایوس ہو کر خود ہی ٹل جائے گا۔"

رات کے کھانے پر بہن نے بہت انتظام کیا ہوا تھا۔ شاید یہ لذت کام و دہن ہی مجھے ہر سال یہاں کھینچ لاتی ہے۔ مٹی کی محبت بھی عجیب شے ہے۔ پتھر اپنی جگہ چھوڑ دے تو مشکل سے ہی کہیں جم پاتا ہے۔

"بھئی ندا کو لانے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔" جاوید نے استفسار کیا۔

"نہیں ابو، ماموں بالکل وقت پر پہنچ گئے۔" میرے جواب دینے سے پہلے ہی ندا بول پڑی۔

"بھئی... ندا بہت سمجھ دار نکلی ہے۔ تم اس کی طرف سے پریشان مت رہا کرو۔" میں نے جاوید کو تسلی دی۔

"ایک لڑکا اس سے فون نمبر مانگ رہا تھا۔ میں تو حیران رہ گیا، ندا نے کتنے سلیقے سے اسے نظر انداز کیا۔" میں نے فخر اور محبت سے اپنی بھانجی کی طرف دیکھا۔

ندا کے چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ کانٹا میز پر رکھ کر میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں نے کوئی حماقت آمیز بات کہہ دی۔





"کیا مطلب، لڑکا فون نمبر مانگ رہا تھا؟" جاوید کا لہجہ اچانک جارحانہ ہو گیا۔

"کچھ نہیں ابو، ماموں کو غالباً غلط فہمی ہو گئی ہے۔" ندا کے لہجے میں آنے والے لمحوں کے خدشات تھے۔

اب کھانے کی میز پر فضا میں واضح تناؤ تھا۔ سمیرا بالکل خاموش تھی۔ بہن میری طرف شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"پھر تم نے اس لڑکے کا کیا حشر کیا؟"

"بھئی مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ندا نے پہلے ہی اسے پلٹ کر جواب دے دیا تھا۔ انتہائی وقار اور اعتماد کے ساتھ۔" میرے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"پھر تم وہاں تھے ہی کیوں؟ تم نے اسے تھپڑ نہیں مارا۔" جاوید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"جاوید، اس سے بلاوجہ بات بڑھ جاتی۔ وہ لڑکا اپنی عمر کی حماقت دکھا رہا تھا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کا بہترین طریقہ وہی تھا جو ندا نے اپنایا۔"

"بلاوجہ بات بڑھ جاتی۔" جاوید نے میری نقل اُتاری۔ "کوئی تمہاری بھانجی کو چھیڑ دے تو تمہیں غیرت نہیں آتی۔" جاوید کے غصے کا نشانہ اب بلاشرکت دیگر میں تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے مگر ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر غیرت کو ابال دینے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے مدافعانہ کہا۔

"یہ اس پہناوے جینز کا اثر ہے۔ سور کا گوشت کھانے والوں کے ساتھ رہتے ہو۔ اسی لیے ڈرپوک اور بے غیرت ہو گئے ہو۔" جاوید کا غصہ کم ہو گیا تھا۔

"جینز ایک پہناوا ہے... رویہ نہیں۔ غیرت میرے ضمیر سے اُٹھ نہیں گئی۔ بلکہ مجھے غیرت اور انسانی رویوں کی بہتر تعریف مل گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو غیرت کا مسئلہ بنانے سے معاشرے میں تشدد کی تلخی گھل جاتی ہے۔" اب میری آواز بھی بلند ہو گئی۔

"بس کریں آپ دونوں۔" بہن نے بے بسی سے ہم دونوں کو ڈانٹا۔

"کل تو تم غیرت کے نام پر کیے جانے والے عورتوں کے قتل اور "کارو" پہ بہت باتیں کر رہے تھے۔ ان کی اساس بھی تو اسی غیرت سے اُٹھتی ہے۔ جس کو تشدد کا لہو پلا کر ہمارا معاشرہ پال رہا ہے۔" میں نے جاوید کو مزید سنائیں۔

جاوید نے مزید کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ مجھے گھورتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے

دن میں دانستہ جاوید کے جانے کے بعد کمرے سے نکلا تا کہ ناشتے پر جاوید سے سامنا نہ ہو۔شام ہونے تک دونوں کا غصہ ختم ہو جاتا اور پھر میں یہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔اپنے بہنوئی کو معاشرتی علوم کا سبق دینے تو نہیں۔بہن باورچی خانے میں گھسی رہی۔وہ غالباً تنجن اور پلاؤ میں کل کل کی تلخی کو بھون دینا چاہتی تھی۔آج اس نے ہم دونوں کی مشترکہ پسند کا خوبانی کا میٹھا بھی تیار کیا۔

شام چار بجے جاوید اور ندا ساتھ ہی گھر میں داخل ہوئے۔جاوید کی قمیص سامنے سے پھٹی ہوئی تھی۔جاوید کی گھڑی اس کے کلائی کی بجائے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ندا تیز تیز قدموں باپ سے آگے جا کر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

''یہ کیا ہوا آپ کو،قمیض کیسے پھٹ گئی؟''میری بہن بدحواسی سے بڑھی۔

''میں نے اس خبیث کو مزہ چکھادیا۔''جاوید کے لہجے میں فخر کا نشانہ میں ہی تھا۔

''ندا...ندا بٹیا تم بتاؤ کیا ہوا؟''میں نے ندا کو آواز دی۔

''ماموں آپ ابو کو سمجھائیں۔آج ابو کو وہ لڑکا نظر آ گیا،ابو نے بلاوجہ اسے تھپڑ مار دیا۔جواب میں قمیض پھڑوا کے آ گئے۔سب لڑکیوں کے سامنے میرے ابو اس احمق لڑکے سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔''ندا اب آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

''ہاتھا پائی کر رہے تھے؟''جاوید نے استہزائیہ انداز پوچھا۔ایسا تھپڑ رسید کیا ہے کہ آئندہ میری بیٹی سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔اگر کل یہی تھپڑ تم نے مار دیا ہوتا تو آج وہ خبیث،حرام زادہ وہاں موجود نہ ہوتا مگر تمہاری رگوں میں تو امریکی غیرت دوڑ رہی ہے؟''

میں ہکا بکا جاوید کو دیکھ رہا تھا۔میں نے اسے پہلے کبھی بچوں کے سامنے ایسی زبان استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔

''جاوید تمہیں مغربی سماج کی بے غیرتی کا بہت گلہ ہے اور اپنی غیرت مندی پر بہت نازاں ہو مگر مغرب ان کھوکھلے غیرت کے مقبروں سے دوسو سال پہلے باہر نکل آیا ہے مگر ہم ابھی تک غیرت یا خاندان کے نام پر اپنی عورتوں کے چہرے تیزاب سے مسخ کر رہے ہیں،ان کی شادیاں قرآن سے کر رہے ہیں یا انہیں کاروکاری کر رہے ہیں۔میں نے کہہ تو دیا مگر یہ وقت معاملے کو دبانے کا تھا۔مجھے جاوید سے اس حماقت کی امید نہیں تھی۔

''کل آپ اکیلے نہیں جائیں گے...ندا کو لینے۔بلکہ میرے خیال میں تو ندا تم ایک دو دن





جاؤ ہی نہیں کالج۔''بہن نے فکرمندی سے صلاح دی۔

''ہاں امی...میرا بھی یہی خیال ہے کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو۔''

''نہیں۔اس سے وہ لڑکا سمجھے گا ہم ڈر گئے ہیں۔اس کی ہمت اور بڑھے گی۔''جاوید قطعیت سے بولا۔''ندا تم ویسے ہی کالج جاؤ گی اور میں تمہیں شام میں لے لوں گا۔''

''کل تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''میرے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ جاوید نے مزید بحث نہیں کی۔اس کی خاموشی سے سب نے نیم رضا کا مطلب نکالا۔

اگلے دن صبح کو ندا کالج جانے پر بالکل تیار نہ تھی مگر باپ کے سامنے ایک نہ چلی۔شام تین بجے کے قریب میں بھی جاوید کے بینک جا پہنچا تا کہ اس کے ساتھ جا کر ندا کو کالج سے لے لوں۔کالج کا منظر وہی تھا۔بے قطار،ہر سمت میں آڑی ترچھی گاڑیاں جمع تھیں۔کچھ گاڑیوں سے ایک بے ہنگم موسیقی کی آواز اطراف کے سب سامعین کو زبردست محظوظ کر رہی تھیں۔سننے والوں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ جب تک وہاں ہیں اس کو برداشت کریں۔اکّا دکّا لڑکیاں،گیٹ سے نکلنا شروع ہوگئی تھیں۔میں نے دور ہی سے پہچان لیا تھا کہ وہ لڑکا بھی اپنی گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔

میں نے سوچا اس سے جا کر نرمی سے بات کروں اور سمجھاؤں مگر اس سے پہلے ہی جاوید گاڑی سے اُتر کر لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔کوئی چارہ نہ پا کر میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔اس لڑکے کی پشت میں بھی غالباً کوئی تیسری آنکھ لگی تھی کہ اسے اپنی سمت بڑھتے ہوئے خطرے کا احساس ہو گیا۔وہ پلٹا اور لمحہ میں وہ اور جاوید آمنے سامنے تھے۔اچانک برابر میں کھڑی گاڑی میں سے تین مزید نوجوان اُتر آئے۔ان کے تیور جارحانہ تھے۔دو نے مٹھیاں کس رکھی تھیں اور ان میں کوئی کلپ نما چیز نظر آ رہی تھی۔

''کل میں نے کہا تھا کہ اب تیری منحوس شکل نظر نہ آئے مگر تو بڑا بے غیرت ہے۔لگتا ہے کل کا تھپڑ بھول گیا۔''جاوید نے لڑکے کو للکارا۔

''یہ جگہ تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔اپنی بیٹی کو لینے آئے ہو لے کر دفعہ ہو جاؤ۔باقی رہی میری زبان تو اس پر تم پابندی نہیں لگا سکتے۔''آج لڑکے کے تیور دوسرے تھے۔گاڑی سے اُترنے والے تین جوان بھی اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

''جاوید...ہٹو مجھے سمجھانے دو۔''میں نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

’’باپ تک پہنچتا ہے، باپ تک پہنچتا ہے۔‘‘ جاوید نے میرا ہاتھ جھٹکا۔ وہ غصے سے اب پاگل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکے پر ہاتھ اُٹھاتا، اس کے دائیں جانب کھڑے لڑکے نے مٹھی میں دبا کلپ جاوید کے منہ پر مارا۔ میری مداخلت سے وہ وار پھسلتا ہوا جاوید کے ہونٹ کو کاٹتا گزر گیا۔ خون کے قطرے ہونٹوں سے ٹپک کر جاوید کی قمیض کو داغ دار کر رہے تھے۔ نا چاہتے ہوئے بھی مجھے اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ جب تک ندا باہر آتی وہ چاروں لڑکے ہماری پٹائی کر کے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔ میرے تو دو چار ہاتھ ہی پڑے تھے۔ جاوید کا ہونٹ سوج کر دوگنا ہو گیا تھا اور قمیض پر خون کے دھبے دیکھ کر ندا کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے ہم دونوں کو گاڑی میں دھکیلا اور گھر کا رخ کیا۔

جاوید کا حال دیکھ کر میری بہن بدحواس ہو گئی۔ گیلے تولیے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ ساتھ ساتھ روتی جاتی اور اس لڑکے کو بددعائیں دیتی جاتی تھی۔

’’میں نے بہت غلطی کی۔ مجھے انتظام کر کے جانا چاہیے تھا۔‘‘ جاوید نے تاسف سے کہا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ میں نے چونک کر پوچھا۔

’’کچھ نہیں یار۔ معاف کرنا میں نے تمہیں بلاوجہ گھسیٹ لیا۔ تم امریکہ سے یہاں مار کھانے تو نہیں آئے تھے۔‘‘ جاوید نے بات ٹالی۔

’’جاوید صاف بات کرو۔ انتظام سے کیا مطلب ہے؟‘‘ میں نے سختی سے پوچھا۔

’’کچھ نہیں یار۔ اب کل اس لڑکے سے معاملہ رفع دفع کر لوں گا۔ تمہیں ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں‘‘ جاوید کے لہجے میں وہی سکون تھا جو طوفان سے پہلے ساحل پر ہوا کرتا ہے۔

’’کل ندا اور تم ہرگز نہیں جاؤ گے۔ میرا دوست یہاں ایس پی تعینات ہے۔ وہ اکثر بلاتا رہتا ہے کہ تم آتے ہو تو ملنے بھی نہیں آتے۔ اس کے ذریعے ذرا لڑکے کو دھمکا لوں تاکہ یہ معاملہ ختم ہو۔‘‘

’’اور یہ جو ہم نے چہرے پر زخم کھائے ہیں اور اس نے جو ہماری بیٹی کو چھیڑا ہے۔‘‘ پولیس ذرا اس کو دھمکا لے اور معاملہ برابر، ختم؟‘‘ جاوید کے ذہن میں نا معلوم کیا تھا۔

’’تو کیا چاہتے ہو قتل کرو گے اس کو؟‘‘ میں نے طنزاً پوچھا۔

’’یہ میں نے کب کہا ہے۔ یہ بات ویسے بھی تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔ تم بہت زیادہ عرصے سے ملک سے باہر رہے ہو۔‘‘ جاوید کا سکون دیدنی تھا۔ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کے وہ





پُرسکون ہو گیا ہو۔

’’بہرحال جب تک میں ایس پی سے بات نہ کر لوں ندا کالج نہیں جائے گی۔ اگر یہ فیصلہ منظور نہیں تو میں جا رہا ہوں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔‘‘ میں نے اسے دھمکایا۔

’’ہاں بابا کہہ دیا ناں۔ ندا تم کل کالج مت جانا۔ پہلے ماموں ذرا ایس پی سے بات کر لیں نہ جانے کیوں جاوید کا لہجہ مجھے کھٹک رہا تھا۔

دوسرے دن صبح جاوید کچھ دیر سے دفتر گیا۔ میں نے بھی اس کے جانے کے بعد ندا اور اپنی بہن کو تسلی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ لڑکے ایس پی سے پنگا مول نہیں لیں گے۔ پھر میں نے ایس پی آفس فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر بہت خوش ہوا۔

شام سات بجے ملنے کا وعدہ کیا۔ بلکہ اصرار کیا کہ شام وہ مجھے اپنے گھر لے جائے گا اور اس کے خاندان سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور رات گئے تک گپ شپ لگے گی۔ اس کی بیوی اکثر شاکی رہتی ہے کہ اس کے بچپن کا کوئی دوست نہیں کیا؟ آج وہ سب کو سرپرائز دے گا۔

غیر متوقع طور پر شام چار بجے ایس پی کا پھر فون آ گیا۔ اس نے مجھے فوراً اپنے آفس بلایا اور بتایا کہ پولیس نے جاوید کو لڑکیوں کے کالج کے سامنے سے گرفتار کر لیا ہے۔ جاوید کو رات میں ایس پی سے اپنی دوستی کے بارے میں بتا چکا تھا۔ ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بہن رونے لگی۔ ندا کی ہچکی نہیں تھمتی تھی کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ پہلے اکیلے جا کر مل لوں مگر بہن منت سماجت اور قسما قسمی کر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ندا اور سمیرا نے ان حالات میں اکیلے گھر میں رہنے سے انکار کر دیا وہ بھی ساتھ ہو لیں۔

ایس پی آفس جا کر پتا چلا کہ جاوید آج بینک گیا ہی نہیں تھا بلکہ وہ گھر سے بینک کا بہانہ کر کے نکلا تو چور بازار سے جا کر ریوالور خریدا۔ ہتھیار سے لیس وہ چار بجے لڑکیوں کے کالج جا پہنچا۔ وہ لڑکے آج پھر موجود تھے۔ بات بڑھ گئی۔ جاوید نے ریوالور نکال کر اس لڑکے اور اس کے ساتھی پر گولی چلا دی۔ باقی دو لڑکے بھاگ گئے۔ ایس پی نے بتایا کہ دونوں لڑکے اسپتال میں ہیں مگر بچ جائیں گے۔ جاوید حوالات میں ہے اور اسے رہا کرنا اس وقت ممکن نہیں۔ اس نے بہت معذرت کی کہ دوستی کے باوجود جاوید کو رہا کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے کیوں کہ جاوید بہت سے لوگوں کے سامنے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ میرے اصرار پر اس نے جاوید کو اپنے آفس بلا لیا۔

جاوید کمرے میں داخل ہوا تو اس کے دونوں ہاتھ سامنے تھے اور ان میں ہتھکڑی پڑی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر ندا کی سسکی نکل گئی۔ بہن کی بین کی آواز آفس میں گونج رہی تھی۔

''ابو...اب آپ تو جیل چلے جائیں گے۔ آپ نے پتا نہیں کتنے سالوں کے لیے صرف ہمیں ہی نہیں کھویا، بلکہ میں نے اس غیرت کو بھی کھو دیا ہے جس کے سہارے میں فخر سے سر اونچا کر کے چلتی تھی اور وقار سے زندگی گزار رہی تھی۔ اب میں ایک قیدی کی بیٹی ہوں، ایک قیدی کی بیٹی ہوں۔''

ندا کی سسکیاں کمرے میں گونجتی رہیں، بہن نے آگے بڑھ کر ہتھیلی سے ندا کا منہ بند کر دیا اور خود بے آواز اپنے اندر کہیں رونے لگی۔

☆☆☆☆☆





# معکوس

میری عادت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو شام کو سمندر کے کنارے چہل قدمی کروں۔ میرے فلیٹ سے کوئی دو میل کے فاصلے پر سمندر میلوں تک دوڑتا چلا گیا ہے۔ اس کی مسابقت میں ساحل بھی سائے کی طرح ساتھ ہے۔ مست، بے قابو لہریں کسی عاشقِ صادق کی طرح پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جھاگ اُگل دیتی ہیں۔ پتھروں سے ٹکراتے سمندر میں لوٹتے وقت ساحل پر قسم قسم کے گھونگھے، سیپیاں، شیشے کے ٹکڑے اور اسی قسم کا الم غلم پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ ساحل کی ریت ہر لحظہ دُھل دُھل کر سفید ہو گئی ہے۔ صبح سے شام تک یہاں لوگوں کی خاصی ریل پیل رہتی ہے۔ ایسے میں جب شام ڈھلے پرندے ایک ڈار میں اور بندے ٹولیوں میں اپنے اپنے کنج کی جانب لوٹ رہے ہوتے ہیں تو میں بھی ساحل پر ایک دو میل کی چہل قدمی سے سارے دن کی تھاوٹ دور کرتا ہوں۔ جوتے ہاتھ میں، ننگے پاؤں، شرٹ آدھی اندر...آدھی باہر۔ ساحل پر آتا جاتا پانی جب پیروں کو بھگوتا ہے تو لگتا ہے جیسے تھکن کو دھو کر نتھار رہا ہو۔ پیروں کے نیچے سے ریت یوں سرکتی ہے کہ گویا پیروں کو گدگدا رہی ہو۔

آج منگل ہے۔ بینک میں کام بہت تھا اور ساحلِ سمندر روزانہ سے زیادہ ہی مزہ دے رہا تھا۔ تھکاوٹ جتنی زیادہ ہو مالش اتنا زیادہ مزہ دیتی ہے۔ کسی بھی چیز کا فائدہ طالب کی ضرورت پر بھی منحصر ہے۔ بائیں ہاتھ پر سمندر کی جوشیلی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں مصروف تھیں۔ دائیں ہاتھ پر پتھروں کے درمیان کوئی شے سورج کی ڈوبتی کرنوں میں چمک

رہی تھی۔ میں نے نسبتاً قریب جا کر دیکھا تو آئینے کا کوئی چھ انچ کا محیط ٹکڑا تھا۔ ایک کونا ایسے صفائی سے کترا ہوا تھا جیسے کسی نے اپنی قمیض کے لیے ایک بٹن توڑ لیا ہو۔ میری دلچسپی مطمئن ہوگئی۔ بے کار جان کر میں نے اسے ہاتھ بھی نہ لگایا اور آگے بڑھ گیا۔ دفعتاً ایسا لگا جیسے کوئی ہلکی سی آواز سے کہہ رہا ہو ''نہیں...نہیں۔'' میں نے تعجب سے آس پاس دیکھا۔ اب سورج دور اُفق پر غروب ہونے کی تیاری میں تھا۔ ساحل تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ آس پاس کوئی ذی روح نظر نہیں آیا۔ میں اسے اپنا واہمہ سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی آواز آئی ''نہیں...نہیں۔'' کیوں کہ اس دفعہ میری حسیات بیدار تھیں، میں آواز کی سمت کا تعین کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ آپ مجھ سے جس چیز کی چاہے قسم لے لیں، وہ آواز اسی آئینے سے آ رہی تھی۔ لمحے بھر کو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پھر خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ شاید آج میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔ یہ تو ہونا ہی تھا، اتنی محنت کے بعد ابھی صرف آوازیں آ رہی ہیں، پھر شکلیں دکھائی دینے لگیں گی۔ میں باقاعدہ آواز سے ہنس پڑا۔ میں نے ان سب کو نظرانداز کر کے قدم بڑھا دیے۔ اس بار بہت واضح ''نہیں... نہیں'' سنائی دی۔ جیسے آئینہ مجھے آگے قدم بڑھانے سے منع کر رہا ہو لیکن میں دل جمعی سے آگے بڑھ گیا۔ ابھی دو چار قدم ہی لیے ہوں گے کہ لگا جیسے داہنے پاؤں میں آگ سی بھر گئی ہو۔ درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔ پاؤں کی جانب نگاہ کی تو تلوے میں ایک بوتل کا ٹوٹا پیندا پیوست تھا اور بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ تلوے کو دیکھنے کے لیے پیر اُٹھا کر اندر کی جانب گھمایا اور چاہا کہ جھک کر بوتل کا پیندا کھینچ لوں مگر توازن کھو بیٹھا اور بھد سے گرا۔ وہ تو جانیے خیریت ہوئی کہ ساحل ریتلا تھا، ورنہ بہت چوٹ لگتی۔ ریت پر بیٹھ کر بہت کھینچ تان کر پیندا نکالا۔ جیب سے رومال نکال کر بہت دیر زخم کو دبائے رکھا۔ جب خون بند ہوگیا تو رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ پیر ابھی سے تھوڑا ورم زدہ نظر آنے لگا۔ اس حواس باختگی سے جانبر ہوا تو آئینے اور اس کے منع کرنے کا خیال آیا۔ دیکھیے صاحب میں گریجویٹ ہوں اور اللہ کے فضل سے ایک بینک کا ذمے دار ملازم بھی۔ واہمات پر بالکل یقین نہیں اور قطعاً ضعیف الاعتقاد نہیں۔ جنوں اور بھوتوں سے تعلقات کا دعوے دار بھی نہیں۔ اس پس منظر میں یہ امر چاہے جتنا مضحکہ خیز معلوم ہو مگر مجھے مکمل یقین ہے کہ وہ آئینہ مجھے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا تاکہ میں اس زخم سے بچ سکوں۔ آپ بھی تو روز آئینہ دیکھتے ہیں۔ کیا آپ کو آئینہ کبھی آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ اگر آئینہ بولنے لگا اور ہم سننے پر آمادہ ہوں تو خودشناسی کے کیا کیا نہ مراحل طے ہو جائیں۔ نہ جانے کیا سوچ کر میں نے آئینہ اُٹھا لیا اور ساتھ





لے کر گھر واپس آ گیا۔ اب تک پاؤں خاصہ سوج گیا تھا اور کار تک پہنچنا کارِ دشوار ثابت ہوا۔ فلیٹ میں سامنے کے رخ پر ایک راہ داری ہے جو اپنی مسافت میں سب فلیٹوں کے سامنے سے گزرتی ہے اور سب فلیٹوں کے دروازے اسی میں نکلتے ہیں۔ سب مکینوں کو اسی راہ داری سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔ میرا فلیٹ شروع سے دوسرا ہے۔ اس کے بعد مزید تیرہ فلیٹ اس راہ داری میں کھلتے ہیں۔ یوں ان تیرہ فلیٹوں کے مکینوں کو صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے میرے فلیٹ کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے۔ درمیانی طبقے کے دو اور تین کمروں کے فلیٹ ہیں۔ ہر فلیٹ میں دروازے کے دائیں جانب ایک کھڑکی ہے۔ جب سے مہنگائی اور بے روزگاری بڑھی ہے، زیادہ تر کھڑکیوں کے آگے لوہے کی جالی تن گئی ہے۔ میں نے وہ آئینہ جالی کے پیچھے رکھ دیا۔ جالی لگنے کے بعد سے میری کھڑکی زیادہ تر کھلی رہتی ہے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں 'جالی' کو

درد کی گولی کھا کر سو گیا۔ صبح اُٹھا تو بھی زیادہ افاقہ نہیں ہوا تھا۔ بینک جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ناشتے کی پلیٹ اُٹھا کر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اکثر مجرد لوگوں کی طرح یہ میرا بھی مشغلہ ہے۔ کھلی کھڑکی کے پیچھے سے آتے جاتے چہروں پر نظر رکھنا۔ ذرا سی دیر میں عالم صاحب بن ٹھن کر کھڑکی کے سامنے سے گزرے۔ عالم صاحب چھڑے چھاٹ تھے، نہایت کروفر والے۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھتے۔ کنوارے بالے تھے، قد اور کاٹھی، اچھی صورت خاصی یونانی۔ اس پر غضب یہ کہ ایک کمپنی میں منیجر۔ دوسرے فلیٹ والے عالم صاحب سے بہت جلتے تھے اور ان کی پشت پر انھیں قسم قسم کے القابات سے نوازتے۔ جیسے ہی عالم صاحب کھڑکی کے سامنے سے گزرے، مجھے محسوس ہوا جیسے آئینے نے بہت حقارت سے ''ہنہ'' کا ہنکارا ابھرا۔ اس پر ہی بس نہیں، اس کے بعد آواز آئی ''احمق۔'' اس بات میں اب کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ آوازیں آئینے سے آ رہی تھیں۔

''بھئی آئینہ بھلا کیسے بول سکتا ہے؟'' میں نے بہت ہمت کر کے ایک سوال گویا فضا میں اُچھال دیا اور کن اکھیوں سے آئینے کی طرف دیکھنے لگا۔

''جامِ جم کو بھول گئے بس سمجھ لو اسی نسل سے ہوں۔'' استہزائی انداز میں جواب ملا۔

عالم صاحب کے لیے یہ ''ہنہ'' اور پھر ''احمق'' کیوں؟ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''آئندہ لمحے کا احوال جانتے ہو۔'' آئینے نے چیخ کے سوال کیا۔

سوال مشرق جواب جنوب۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں، یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' اس بات کا عالم

UrduDost.com

صاحب سے کیا تعلق ہے؟‘‘ میں نے ناراضگی سے پوچھا۔

’’اگلے سیکنڈ کا حال بھی نہیں جانتے اور جان بھی لو تو اس کو روکنا کیا تمھارے اختیار میں ہے۔‘‘ آئینہ اپنی رو میں ہانکے جا رہا تھا۔

’’بھئی مستقبل کس کے اختیار میں ہے۔‘‘ میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

’’تو پھر اس کر و فر کا مطلب۔ یہ عالم آدمی ہے یا نرا برن شنکر۔ یہ اکڑ تو وہ دکھائے جسے پتا ہو یہ کب تک باقی رہے گی۔ دو منٹ کا حال بھی معلوم نہیں۔ میں نے اس احمق کو احمق اس لیے کہا کہ وہ عمدۃ الملک آج نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ پھر یہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہوگا۔ میاں میں ایسا کہاں کا ممیّز لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ رہے۔ لیکن اس بے چارگی اور بے بسی کے بعد بھی کوئی اکڑفوں دکھائے تو اسے احمق بھی نہ کہا جائے۔‘‘

ابھی آئینے کی تقریر جاری تھی کہ برابر والے فلیٹ سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ میرے بائیں جانب والے فلیٹ میں زبیدہ اور حیدر مقیم تھے۔ دونوں کا ہی تیس کا سن ہوگا۔ ابھی اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ یہاں رہتے تقریباً چار سال ہو گئے تھے۔ میں نے تو انھیں روزِ اوّل سے ہی لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ لڑائی جھگڑا کس گھر میں نہیں ہوتا۔ مگر یہاں سے اکثر برتن ٹوٹنے اور چیزیں دیواروں سے ٹکرانے کی کچھ زیادہ ہی آوازیں آتی تھیں۔ لگتا تھا آج پھر صبح ہی صبح دونوں میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ میں غور سے ان کے مکالمے سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک دھماکے سے ان کے فلیٹ کا دروازہ کھل کے بند ہوا۔ حیدر تیز تیز قدموں سے میری کھڑکی کے سامنے سے گزرے۔ پیچھے سے زبیدہ کے چیخنے چلّانے کی آوازیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔

’’ہائے!‘‘ آئینے سے ایک دردناک آواز اُٹھی۔

’’اب کیا ہوا۔ میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ جہاں دو برتن ہوں، وہ آپس میں ٹکرائیں گے بھی اور بجیں گے بھی۔‘‘ میں نے گویا اسے جھاڑ پلائی۔

’’ہاں مگر بعض دفعہ ٹکرانے والے برتن ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔‘‘ آج حیدر میاں کا آخری دن ہے۔ اسی غصے سے سڑک پار کریں گے اور ایک ویگن کے پہیوں تلے کچلے جائیں گے۔ اک ڈور سے بندھی ہے زندگی میاں۔ اب باقی ساری عمر یہ روئے گی کہ جاتے وقت میں حیدر کو کوس رہی تھی۔ شاید اسی لیے چل بسا۔ کچھ دنوں کی تو کہانی ہے۔ اسے ہنس کر کیوں نہیں بتا لیتے۔ بس ذرا اپنی ’’میں‘‘ قابو میں آجائے تو کیسا سکھ ہو جائے؟ اے ایاز قدر خوش باشناس۔ جانے کس گھڑی میں اسے اشرف المخلوقات کا خطاب مل گیا۔‘‘



UrduDost Library

آئینہ بلاتوقف بولے جا رہا تھا۔ میں باہر کی جانب لپکا کہ حیدر کو خبردار کر دوں مگر اپنے پاؤں کی چوٹ کی وجہ سے تیزی نہ دکھا سکا اور حیدر ہاتھ نہ آئے۔ کمرے میں واپس آیا تو آئینہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

’’اگر اسے اپنی مخلوق کو آگے کا حال بتانا ہوتا تو وہ نہیں بتا سکتا تھا جو تم لپکے تھے۔ اس کا کھیل بگاڑتے ہو۔‘‘ غصے سے آئینے کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ رنگت تپ کر سرخ ہو گئی تھی، اطراف میں گویا شعلوں کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔

’’کسی کے ساتھ حادثہ ہونے والا ہو تو اسے بتانا تو چاہیے؟‘‘ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

’’ہاں ضرور اگر یہ اندیشہ، فکر یا شبہ تمھارے خیال میں آئے۔ لیکن اگر میری زبان سے سن کر قدم آگے بڑھایا تو گویا قدرت کی سائیکل کے پہیے میں لکڑی اڑا دی۔

کہتے ہیں کہ آنکھ دیکھتی ہے۔ لیکن اگر آنکھ کے ساتھ دل اور دماغ بھی دیکھنے لگیں تو بہت سے حادثے رک جائیں، آئندہ جو مجھ سے سنو گے، وہ بات آگے نہیں بڑھے گی۔ ورنہ اتنے بہت سے دوسرے آئینے خاموش ہیں، میں بھی خاموش ہو جاؤں گا۔‘‘ آئینے بولنے لگیں تو بہت ہنگامے ہو جائیں، انھیں خاموشی سے منظر دیکھنے دو۔‘‘

میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ آپ یقین جانیے، اس دن واقعی عالم صاحب اپنی نوکری کھو بیٹھے اور حیدر کی لاش جب ایمبولینس میں آئی تو فلیٹوں میں کہرام مچ گیا۔ اپنی اپنی مصروفیات میں پھنسے لوگ جب کسی کو اَن ہونی تکلیف میں دیکھتے ہیں تو ایک ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے یہ حیوانی جبلت ہے یا تقدیر کے ہاتھوں پسپائی سے پہلے کا آخری دفاع۔

اب میرے شب و روز بہت دل چسپ ہو گئے تھے۔ میرا ساحل پر جانے کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ نوکری سے واپس آ کر میں اشتیاق سے کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ آئینہ اپنی طنز گوئی سے باز نہ آتا۔ سڑک پر چلتے ہر راہ گیر، فلیٹ کے ہر مکین، جس کا عکس بھی اس آئینے میں اُبھرتا، اس کے متعلق ضرور تبصرہ ہوتا۔ انسان اتنا کم زور اور بے بس ہے مجھے اس سے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے بھول بھلیوں میں چھوڑ دیا گیا ہے، جہاں ہر موڑ نیا ہے، کبھی راستہ بند ملتا ہے اور کبھی ایک راستہ دوسرے راستے تک لے جاتا تھا۔ انسان اسی بھول بھلیوں میں ایک موڑ سے دوسرے موڑ تک سرگرداں رہتا ہے، یہاں تک کہ کسی موڑ پر زندگی کی شام ہو جائے اور کھیل کا وقت گویا ختم ہو جائے۔

آئینہ مجھے میرے آئندہ کے احوال سے باخبر رکھتا۔ بولتا، ’’میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔

اگر میں تمھیں روزانہ کا احوال صحیح بتا دوں تو اس سے تمھاری زندگی اور مستقبل پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟" ایک دن بہت موڈ میں آ کر پوچھا۔

میں اس خیال ہی سے اُچھل پڑا۔ سوچیے! روز آپ کو پتا ہو کہ آج کیا ہونے والا ہے۔ یہ اسٹاک خریدلوں، قیمت بڑھ جائے گی یا گھٹ جائے گی۔ اس لڑکی کو شام کی چائے پر بلاؤں تو سلسلہ کیسا رہے گا۔ مجھے دل کا دورہ پڑے گا یا سرطان کا مرض ختم کرے گا۔ میں تو امکانات سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔

"اس میں خطرہ ہے کہ تم بہت ٹوٹ جاؤ گے۔" آئینے نے مجھے سمجھایا۔

"مجھے پروا نہیں...تم میری فکر نہ کرو۔ بس ہر بات سچ سچ بتانا۔" میں مسرت سے چلّایا۔

"پروا کیسے نہ کروں، تمھارا آئینہ ہوں اور میاں مثل یونہی تو مشہور نہیں کہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوتا تھا۔

اب آئینہ کبھی کبھی صحیح کوئی پتے کی بات بتا دیتا۔ یہ اس کے موڈ پر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تو ہر موڑ پر مجھ سے گفت گو کرتا ہے، میں ہی سننے اور سمجھنے سے عاجز ہوں۔

"لاٹری نکلتی ہے، کون سے نمبر لے لوں۔" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" کم بخت صاف مکر گیا۔

"سنو، آج نکڑ کی دکان سے نہاری مت کھانا، معدہ خراب ہو جائے گا۔"

"قریشی صاحب کو اُدھار مت دینا، واپس نہیں ملے گا۔"

"آج شام تمھارے گھر مہمان آنے والے ہیں۔"

مجھے لگتا تھا، وہ اسی قسم کی بے ضرر خبروں سے مجھے خوش رکھتا تھا، کم بخت نے ایسی کوئی بات نہ بتائی جس سے میرے مالی حالات پر کوئی نمایاں فرق پڑے۔ یہ خیال مجھے کھائے جاتا تھا کہ یہ لاٹری کے نمبر بتا دے تو زندگی سنور جائے۔ جب بھی میں نے شکوہ کیا تو بولا، "لاٹری تو تیرے ہاتھ میں ہے۔ برسے ساون تو پانچ کے ہوں باون۔ تو پہلے پانچ تو بنا۔" ایسے اُلجھا دینے والے جوابات مجھے کیا فائدہ دیتے۔ اب میرے اس سے تعلقات ایک نئی سطح پر پہنچ گئے تھے۔ میرے سیدھے سادھے مطالبات کے جواب میں گھماؤ، اُلجھاؤ، اشارے اور کنایے۔

عالم کا فلیٹ اب خالی ہو چکا تھا اور اس میں وہ قتالہ آ بسی تھی جس کے گزرنے پر میری کھڑکی کے دونوں پٹ کھل جاتے تھے۔ میرے بہت اُکسانے پر بھی آئینہ اس کے متعلق کسی تبصرے، کسی





پیشین گوئی سے پرہیز کرتا۔ اسی دوران میری اَن تھک محنت کام لائی اور میرا بیرونِ ملک برانچ میں ٹرانسفر ہو گیا۔ مجھے یہ غم کہ یہ ٹرانسفر آرڈر لے لوں تو اس قتالہ سے کیسے معاملہ بڑھے۔ آئینہ مجھے خوب بڑھاوے دیتا، "ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست۔"

مجھے لگتا تھا آئینہ مجھے اس سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ ادھر دل کا یہ حال کہ صبح وشام بھنگڑا ڈالے۔ لگتا تھا مجھے زندگی کا ساتھی مل گیا۔ اس کی طرف سے بھی مجھے قبولیت کے اشارے مل رہے تھے۔ تنگ آ کر سوچا آئینے سے بات صاف کر لوں۔

"میں اس قدر اکیلا ہوں آخر اس سنجوگ میں کیا برائی ہے۔ وہ خوش شکل ہے، پڑھی لکھی ہے، خوش اطوار ہے، اچھے خاندان کی ہے۔ تمھیں کیوں دورے پڑ رہے ہیں۔"

آئینہ بہت رسان سے بولا، "آدمی ازل سے اکیلا ہے۔ اپنے اندر جھانک لے، اتنے ہجوم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔ یا وجہ بتاؤ یا راستے سے ہٹ جاؤ۔" اب میری آواز میں غصہ تھا۔

"آئینہ صرف سچ بولتا ہے۔" اپنے منہ میاں مٹھو۔

اب میں غصے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کی طرف دھمکی آمیز قدم بڑھایا۔

"جب انسان ہارنے لگے تو مار پیٹ پر اُتر آتا ہے۔ جس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہو وہ جنگ کا سہارا نہیں لیتا۔" آئینے کی فلسفہ آمیز گفت گو مجھے اور تپا رہی تھی۔ میں نے جھلّا کر آئینے پر ہاتھ مارا۔ چھناکے کی آواز سے آئینہ چھوٹے چھوٹے گول گول ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

"ہر ٹکڑا ایک آدمی کی قمیص میں ٹانک دو تا کہ وہ صبح وشام اپنا دیدار کر کے قدم آگے بڑھائے۔ بہت سے حادثوں سے بچا رہے گا۔ یہ خود آگاہی اسے یقیناً دوسری مخلوقات سے اشرف کرے گی۔"

اب میرا غصہ برداشت کے سب ڈھکنے ہٹا کر اُبل رہا تھا۔ میں نے جھاڑو سے سب ٹکڑے جمع کیے اور ایک اخبار میں لپیٹ کر باہر کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیئے۔ کوڑے کا ڈرم سب سے آخری فلیٹ کے سامنے رکھا تھا۔ اس آخری فلیٹ میں سعود کا قیام تھا۔ سعود کی بیوی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی اور سعود کی رنگین مزاجی فلیٹ کی خواتین میں زیرِ بحث رہتی۔ آئینے کے ٹکڑے پھینک کر میں پلٹا تو ناگاہ نظر سعود کے فلیٹ کی کھڑکی پر جم گئی۔ وہ قتالہ ہنس ہنس کر سعود سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کی جسمانی قربت کی گرمی نے میری اُمنگوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

☆☆☆☆☆

UrduDost Library
UrduDost.com

## مجتبیٰ حسین (حیدرآباد، انڈیا)

کچھ دن ہوئے حسن چشتی اور قمر علی عباسی کی وساطت سے ڈاکٹر سید سعید نقوی کے چند افسانے پڑھنے کا موقع ملا۔ منشی پریم چند کے دور سے لے کر آج تک افسانہ نگاری کے فن میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں... ان کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہوگا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سچا فن کار بندھے ٹکے اصولوں کا پابند نہیں ہوتا۔ زندگی کے تجربات، اپنے دور کے حالات اور اس کی انسان دوستی اسے قلم اُٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کی کہانیوں میں بڑی تازگی ہے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دل چسپی پہلی سطر سے شروع ہو جائے اور آخر تک قائم رہے۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی کی کہانیوں میں یہ خوبی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اس قلم کار نے دنیا دیکھی ہے۔ زندگی کو برتا ہے اور انسانی نفسیات کی گتھیوں کا اسے پوری طرح علم ہے۔

''تعویذ'' ایک بھولے بھالے معصوم نوجوان کے پاکیزہ احساسات کی ترجمانی ہے۔ ''دین کے محافظ''، اور ''کالی آندھی''، مذہب کے غلط تصور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر روح لرز جاتی ہے۔ ''آخرِ شب'' انسانی کرب اور پچھتاوے کی بہترین مثال ہے۔ کہانی ''موٹا'' لڑکپن کے جذبات کی عکّاسی کرتی ہے۔

یہ ڈاکٹر سید سعید نقوی کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں، وہ خیال کو لفظوں میں ڈھالنے کا فن بہ خوبی جانتے ہیں۔ ان کی تحریر میں وہ سادگی ہے جو سچائی سے پیدا ہوتی ہے۔ گرچہ یہ ان کے فن کی ابتدا ہے۔ لیکن اس ابتدا میں کہیں کوئی کچا پن دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ایسی پختگی ملتی ہے جو ایک روشن مستقبل کا پتا دیتی ہے۔ میں ڈاکٹر سید سعید نقوی کو ان کی پہلی کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی بعد میں آنے والی کتابوں کا منتظر ہوں۔

—— ——

## ڈاکٹر اختر ہاشمی (کراچی)

''نامہ بر'' میں شامل افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر سید سعید نقوی نے مختلف علوم کی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ مختلف النوع مذاہب، رنگ، ذات، نسل اور جدا جدا کردار کے حامل انسانوں کا بھی بہ غور مطالعہ کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے اکثر افسانوں میں زندگی کے نشیب و فراز، قول و فعل میں تضاد، چہرے پر چہرہ کا بہروپ، غربت و امارت کا فرق اور ہر آن بدلتے ہوئے چہروں کے تاثرات کے مشاہدات اور قدم قدم پر پیش آنے والے تلخ و شیریں تجربات بیان ہوئے ہیں۔ ایک اچھا، سنجیدہ اور سچا فن کار وہی ہوتا ہے جو اپنے فن سے محبت کرتا ہو اور تخلیقی عمل کو ایک فریضہ سمجھ کر ادا کرتا ہو۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی بھی ایک ایسے ہی سچے، مخلص اور سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ جو انسان کے ہر رویے کو اپنی نظر کے مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور کسی مصور کی طرح قرطاس پر الفاظ کے برش اور محسوسات کے رنگوں سے پینٹ کر دیتے ہیں۔

—— ——

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کوم

www.UrduDost.com